کتاب ہر مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے،

چراغ دیر و حرم
رقص طاؤس
از صفدر حسین صفدر، صفحات ۱۲۰ و ۱۳۳، کتابت وطباعت اعلیٰ، ناشر بارگاہ ادب ۵/۱۳۰۲ ڈرگ کالونی، کراچی ۲۵، شردھانند اسکوائر جین روڈ کرشن نگر۔ لاہور:

ڈاکٹر صفدر حسین ایک پختہ مشق شاعر ہیں، وہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی، چراغ دیر و حرم انکی غزلیات کا اور رقص طاؤس ان کی نظموں کا مجموعہ ہے، ان کی غزلوں میں تغزل کی قدیم وجدید اور لفظی ومعنوی دونوں طرح کی خوبیاں موجود ہیں، کلام میں پختگی، روانی اور برجستگی بھی ہے، اور ذہن رسا کے مشاہدات اور دل گداز کی کیفیات و واردات بھی ہر ہر غزل سے نمایاں ہیں، نظمیں انھوں نے زیادہ تر معرا لکھی ہیں، گر وہ حسن معانی اور پاکیزگی تخییل سے معرا نہیں ہیں، امید ہے کہ ان کے دونوں مجموعے اہل ذوق کے قلب و دماغ کیلئے تسکین کا سامان فراہم کریں گے۔ کتابت وطباعت کلام کے شایان شان ہے، ان کے شان تغزل کا اندازہ ذیل کے چند اشعار سے بخوبی ہوجائے گا۔

اہل دل کوچۂ اصنام تک آپہنچے ہیں — فاصلے عرصۂ دو گام تک آپہنچے ہیں
جو بہ خم ہو باقی وہی دیدے ساقی — بادہ کش دردِ تہِ جام تک آپہنچے ہیں
ہائے وہ لوگ جو ہوں لذت آغاز میں گم — وائے وہ لوگ جو انجام تک آپہنچے ہیں
آرائشِ جمالِ جہاں تاب کی قسم — میرے جگر کا خون بھی رنگِ سحر میں ہے
دل کانپ کانپ اٹھتا ہے منزل کے نام سے — صفدر کوئی فریبِ دلِ راہبر میں ہے
سکوتِ عشق اظہارِ تمنا اب بھی کرتا ہے — نگاہ ناز کی صرف لن ترانی اب بھی ہوتی ہے
چمن والوں کے آداب جنوں کا معجزہ کہیے — کہ دامانِ خزاں سے گل فشانی اب بھی ہوتی ہے

م، ج

جلد ۹۴ ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۴ء عدد ۶

مضامین

شذرات

اس مہینہ میں بمبئی میں رومن کیتھلک عیسائیوں کی جو کانگریس ہوئی وہ کئی حیثیتوں سے مسلمانوں کے لئے سبق آموز ہے، عیسائیوں نے اپنی مذہبی کانگریس ایک غیر عیسائی ملک میں منعقد کی، ہندستان نے اُس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، صدر و نائب صدر جمہوریہ وزیر اعظم اور دوسرے عمال حکومت نے بمبئی جاکر تقدس مآب پوپ کا استقبال کیا، حکومت نے اُن کی آمد کی یادگار میں مخصوص ٹکٹ جاری کئے، اور کانگریس کے انعقاد میں ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی، پوپ نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے ساری دنیا کے عیسائیوں اور اُن کے مختلف فرقوں کو اپنے اختلافات مٹا کر باہم میں متحد و متفق ہو جانے کی تلقین کی، اور یہ امید ظاہر کی کہ یہ کانگریس اس اتحاد و اتفاق کا ذریعہ ثابت ہوگی،

اُن میں سے کوئی چیز بھی قابل اعتراض نہیں، بلکہ قابل ستائش ہے، پوپ نے اپنا مذہبی حکومت ہند نے اپنا اخلاقی فرض انجام دیا، اور ہم بھی محترم مہمان کے اس اعزاز و اکرام میں شریک ہیں، لیکن مسلمانوں کے لئے یہ کانگریس اس حیثیت سے سبق آموز ہے کہ گو اُن کے یہاں پاپائیت نہیں ہے، لیکن اسلامی ملکوں میں ایسی دینی و سیاسی شخصیتیں موجود ہیں جن کو پوری اسلامی دنیا عظمت و احترام کی نظر سے دیکھتی ہے، اُن میں سے کسی میں بھی یہ جذبہ ہے کہ وہ اپنی ملی وحدت اسلامی اخوت کے لئے کسی اجنبی ملک میں نہیں، بلکہ خود اپنے ملک میں دنیائے اسلام کے مسلمانوں کا اجتماع کرسکے، اُن پر تو قومیت اور وطنیت کا ایسا بھوت سوار ہے کہ اسلامی وحدت کے نام

ہی سے اُن کو وحشت ہوتی ہے، اور اگر کوئی سرپھرا اُس کی آواز بھی بلند کرے تو اس کو مجذوب کی بڑ سمجھا جائے گا اور دوسری قومیں پان اسلامزم کا ہوا کھڑا کرکے اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالیں گی، اور کوئی ملک بھی اپنے یہاں اس قسم کے اجتماع کی اجازت نہ دے گا،

یہ جرأت و ہمت آج بھی انہی عیسائیوں میں ہے جن کو ہم مذہب سے آزاد تصور کرتے ہیں کہ اُن کو اپنی وحدت کے نام سے شرم نہیں آتی، اور وہ دوسرے ملک میں جاکر پوری عیسائی دنیا کو اس کی دعوت دیتے ہیں، جس میں ہندوستان کے عیسائی بھی شامل ہیں، اور ہندوستان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا، بلکہ اس میں ہر طرح کی مدد کرتا ہے، لیکن اگر ہندوستان کے مسلمان اسلامی اخوت اور ملی وحدت کی دعوت دیتے ہیں، تو غیر وفادار اور فرقہ پرور قرار دئے جاتے ہیں، بہرحال اس کانگریس سے ہندوستان اور یہاں کے عیسائیوں دونوں کو فائدہ پہنچا، اس سے عیسائی دنیا میں ہندوستان کی سیکولرزم رواداری اور وسیع القلبی کا نام اونچا ہوگیا، اور یہاں کے عیسائیوں کو امن و سکون کی سند اور بہت سے خرخشوں سے نجات مل گئی،

کہا جاتا ہے کہ یورپ نے مذہب کو سیاست سے بالکل الگ کردیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کو جہاں بھی ضرورت ہوتی ہے آج بھی مذہب کو سیاست کیلئے استعمال کرتا ہے جس سے یہ کانگریس بھی خالی نہیں تھی، امریکہ وغیرہ کمیونزم کے مقابلہ کیلئے جس طرح مذہبی قوموں کے جذبات ابھار رہے ہیں اس سے ہم سب واقف ہیں اس سلسلے اس کا تازہ ثبوت تقدس مآب پوپ کا وہ فرمان ہے جس میں انھوں نے یہودیوں کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دلوانے کے جرم سے بری قرار دیا ہے حالانکہ دو ہزار سال سے عیسائیوں کا یہ متفقہ عقیدہ چلا آرہا تھا کہ یہودیوں ہی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جاسوسی کرکے آپ کو سولی دلوائی تھی اس بنا پر اُن دونوں میں دشمنی چلی آتی تھی، اور آج بھی یہودی حضرت عیسیٰ کو پیغمبر نہیں مانتے لیکن اب یورپ کی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی پرانی عداوت ختم کرکے عربوں کے مقابلہ میں اسرائیل کی حمایت کیجائے اس کیلئے پہلے تقدس

تاب پوپ نے اپنی روایات کے خلاف بیت المقدس کا سفر کیا پھر ایک خاص فرمان کے ذریعہ یہودیوں کو حضرت عیسیٰ کے سولی دلانے کے جرم سے بری قرار دیا، مسلمانوں کو اس سے یہ سبق حاصل کرنا ہے کہ آج بھی یہودی اور عیسائی اپنے مفاد میں متحد ہیں اور اسکے لئے اپنے مذہبی عقائد بھی بدل سکتے ہیں اور اسرائیل کی حکومت تو عیسائیوں ہی کی زائیدہ ہے، ان دونوں میں جو پرانی کھٹک چلی آتی تھی، اس کو پوپ کے فرمان نے ختم کر دیا، دیکھنا یہ ہے کہ عربی النسل عیسائیوں پر اس کا کیا ردعمل ہوتا ہے،

جمہوری کنونشن اپنی بعض خامیوں کے باوجود اس حیثیت سے مفید رہا کہ اس میں ہندو مسلمانوں نے مل کر مسلمانوں کے مسائل و مشکلات پر سیکولر اور قومی نقطۂ نظر سے غور کیا، اور اس کو پورے ملک کا مسئلہ قرار دیا کنونشن میں اکثریت اور حکومت کے نمائندوں نے جو تقریریں کیں اور جو تجویزیں پاس ہوئیں ان میں ایک تقریر کے سوا سب ایک نقطۂ نظر کی ترجمان تھیں، مسٹر کرشنا راؤ نے خصوصیت کیا تھا اپنے خطبہ میں مسلمانوں کی مشکلات پر بڑی صفائی سے بحث کی ہے ان تجویزوں کو عمل میں لانے کیلئے ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ وہ کہاں تک عملی جدوجہد کرتی ہے، فرقہ واریت کا زہر اتنا سرایت کر چکا ہے کہ جب تک پوری قوت اور تنظیم کے ساتھ اس کا مقابلہ نہ کیا جائیگا، اس کا دور ہونا مشکل ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ جس طرح کانگریس نے ہندوستان کی آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کی تحریک چلائی تھی، اسی قوت و تنظیم کے ساتھ اس مہم کو چلایا جائے، اور سیکولر نقطۂ نظر رکھنے والی تمام پارٹیاں اور فرقے مل کر اس کو کامیاب بنانیکی کوشش کریں اور کانگریس اور حکومت دونوں اس میں پوری امداد دیں خصوصاً مسلمانوں کو اس میں زیادہ سرگرمی سے حصہ لینے کی ضرورت ہے، محض بددلی مایوسی اور شکوہ و شکایت سے کام نہیں چل سکتا، ان کی مشکلات قومی سطح پر جدوجہد ہی سے حل ہو سکتی ہے،

ہم نے گذشتہ مہینہ لکھا تھا کہ دسمبر کے پرچہ میں لائف ممبروں کے نام شائع کر دیئے جائینگے لیکن اس مہینہ میں اس کی گنجائش نہ نکل سکی، اور ابھی انکی فہرست اور بعض موعودہ رقمیں بھی نہیں آئی ہیں، اس لئے آئندہ مہینہ سب کے نام ایک ساتھ شائع کئے جائیں گے،

مقالات

ملفوظات خواجگان چشت

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے

(۳)

اسرار الاولیاء کی فصل یازدہم میں ہے:-

"فرمود کہ اے درویش دعاگو برادرے بود، شیخ نجم الدین متوکل نام او بود از حد مشغول، چنانچہ دعاگوئے چندیں سیاحی کردہ است ہیچ کسے را ہم چنیں ندیدم و در ہیچ شہرے نیافتم از انکہ آں زماں کہ او را خوف حق مستولی شدے" (ص ۶۱)

جس طرح اس مجموعہ میں کتابت کی اور غلطیاں ہیں، اسی طرح مذکورہ بالا اقتباس میں نجیب الدین متوکل کے بجائے نجم الدین متوکل کی کتابت ہوگئی ہے، اعتراض یہ ہے کہ ملفوظات کا یہ مجموعہ ۶۴۳ھ میں ختم ہوگیا تھا، اس کے بعد بہت دنوں تک شیخ نجیب الدین متوکل زندہ رہے، پھر ان ملفوظات میں "برادرے بود" کیسے لکھا گیا، حضرت فرید الدین گنج شکر نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ صحیح ہے، یعنی وہ اپنے بھائی کا ذکر، ان کی وفات کے بعد کر رہے تھے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ملفوظات ان کے بھائی کی رحلت کے بعد کے ہیں، اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ملفوظات کے قلم بند ہونے کی جو تاریخ مطبوعہ نسخہ میں درج ہے وہ غلط ہے، اور یہ یقیناً کتابت کی غلطی ہے، جس کو خود پروفیسر صاحب یہ کہکر تسلیم کرتے ہیں کہ

The date given for first fasl in monday 11 Shaban 631 A.H (1233-34) which is impossible to accept

اسرارالاولیاء میں حضرت خواجہ معین الدین کے ذکر میں ہے:-

"دریں میاں لشکر محمد شاہ در اجمیر در آمد پتھورا را زندہ گرفتند" (ص ۷۷)

اس پر اعتراض کرنا بھی قابلِ اعتراض ہے، کیونکہ یہ کتابت کی صریحاً بھونڈی غلطی ہے، اسرارالاولیاء (ص ۳۳) پر بھی سلطان معزالدین محمد بن سام کا ذکر آیا ہے، لیکن وہاں سلطان معزالدین محمد شاہ مرقوم ہے، سام کے بجائے شاہ کی کتابت ہوگئی ہے، مذکورہ بالا عبارت میں بھی معزالدین محمد سام ہی ہونا چاہیے، جو غلطی سے صرف محمد شاہ لکھا گیا ہے، کتابت وطباعت کی غلطیوں سے صاف ظاہر ہے کہ ان رسالوں کی کتابت و طباعت میں وہ اہتمام نہیں کیا گیا جو واقعی ہونا چاہیے، ان غلطیوں سے فائدہ اٹھا کر طرح طرح کے اعتراضات کرنا بالکل مناسب نہیں۔

اسرارالاولیاء کی فصل یازدہم، شانزدہم، ہفدہم اور ہژدہم میں شیخ نظام الدین اولیاء کے ساتھ شیخ بدرالدین غزنوی کا بھی ذکر آیا ہے، پروفیسر صاحب لکھتے ہیں کہ تعجب ہے کہ دونوں کو ایک ساتھ کیسے دکھایا گیا ہے، کیونکہ شیخ بدرالدین غزنوی سے شیخ نظام الدین اولیاء کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی، اور شیخ نظام الدین کے ایک طالب علم کی حیثیت سے دہلی پہنچنے سے پہلے انکی وفات ہوگئی تھی، معلوم نہیں پروفیسر صاحب موصوف نے یہ کیسے لکھدیا ہے، کیونکہ فوائدالفواد میں ہے کہ

"بعد ازاں دریں معنی حکایت فرمود کہ شنودہ ام از شیخ بدرالدین غزنوی کہ او گفت کہ من چوں از غزنین بہ لاہور آمدم" (ص ۴۳)

سیرالاولیاء میں بھی دو جگہوں پر ہے:

"سلطان المشائخ ..... می فرمود کہ از شیخ بدرالدین شنیدم کہ من در خانہ حمید الدین ناگوری در آمدم، دیدم جامہ بشستن دادہ است و ہوا و سرما است، میزری در تہ داشت من جبہ داشتم نو پیش آوردم در حال قبول کرد، و بپوشید و گفت پر تراز من منت است" (ص ۱۶۲)

سلطان المشائخ می فرمود من از شیخ بدرالدین غزنوی شنیدم می گفت کہ شیخ قطب الدین بختیار قدس اللہ سرہ العزیز این دو بیت بسیار گفتے۔ (ص ۱۹۶)

سودائے تو اندر دلِ دیوانہ ماست — ہر چہ نہ حدیث تست افسانہ ماست

بیگانہ کہ از تو گفت او خویش من است — خویشے کہ نہ از تو گفت بیگانہ ماست

ان روایتوں سے صاف ظاہر ہے کہ دونوں میں ملاقاتیں ہوئیں۔

اسرارالاولیاء میں ہے:-

"اس کے بعد فرمایا کہ اے درویش کل قیامت کے دن جب عاشقوں کو مقام تجلی میں لایا جائیگا تو حکم ہوگا کہ آنکھیں کھولو اور عاشقوں میں سے ہر ایک کو سامنے لاؤ تاکہ ان میں ہر ایک کو تجلی نصیب ہو، وہ ستر ہزار سال تک بیہوش رہیں گے، لیکن جب ان کو ہوش آئے گا، وہ فریاد کریں گے کہ پھر تجلی اور نصیب ہو، اسی طرح سات بار کے بعد وہ اپنے مقام پر واپس ہوں گے، جب شیخ الاسلام دام اللہ برکاتہ نے یہ بات ختم کی تو ایک چیخ لگائی اور بیہوش ہوگئے" (ص ۳)

حضرت فریدالدینؒ کے اس قسم کے تحیر اور کیفیتِ سکر کو پروفیسر صاحب نے جھوٹ اور مہمل قرار دیا ہے (a false as it is absurd)۔ لیکن پروفیسر صاحب کے نزدیک فوائدالفواد، خیرالمجالس، سیرالاولیاء، غیر مستند کتابیں نہیں ہیں، بلکہ ان ہی کی روایتوں سے اپنے دعوے کو مستحکم بناتے ہیں، ان میں بھی تحیر کی روایتیں ملیں گی، مثلاً فوائدالفواد (ص ۱۴۴) کی اس روایت کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ایک شعر کو سنکر چار رات دن عالم تحیر میں مدہوش رہے،

اور اسی تحیر میں ان کی رحلت ہوگئی۔

خیر المجالس میں ہے :-

"قیامت کا ذکر تھا، تو خواجہ ذکرہ اللہ بالخیر نے فرمایا، قیامت نزدیک آگئی ہے، دو، ہوگیا ہے، اس ذکر سے بشرۂ مبارک سفید ہوگیا اور حاضرین کھو گئے، اس حال میں فرمایا کہ یاروں کے لیے شیرینی لاؤ، لیکن حاضرین پر قیامت کا خوف ایسا تھا کہ ان کی عمر تلخ ہو رہی تھی، شیرینی ان کے سامنے رکھی رہی، کسی کو کچھ خبر نہ تھی، خواجہ نے خادم سے فرمایا شیرینی واپس لے جاؤ تھوڑی دیر میں پھر لاؤ، اس وقت ہم لوگوں کو پتہ نہیں ہے کہ ہم لوگ آسمان پر ہیں یا زمین پر ہیں، دن ہے یا رات۔ اس حال میں ایک پہر گذر گیا، کوئی دم نہ مارتا تھا، یہاں تک کہ ایک صاحب واپس آئے اور بلند آواز سے سلام کیا، ان میں سے کچھ تو اپنے آپے میں آئے اور کچھ قیامت کے خوف سے اسی طرح مستغرق رہے۔" (ص ۱۲)

سیر الاولیاء (ص ۱۷۲) میں ہے :-

"شیخ شیوخ العالم کی حیات میں مولانا بدر الدین اسحٰق قدس سرہ العزیز نے یہ شعر پڑھا :

پیش سیاست عشق روح چہ نطق تمی زند اے زہزار صوبہ کم پس تو نواچہ می زنی

اس بیت سے عالم تحیر طاری ہوگیا، جب جب یہ شعر پڑھا جاتا بکا اور اہتزاز طاری ہو جاتا، مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا تو شیخ شیوخ العالم نے مولانا بدر الدین اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ سے امامت کرنے کو فرمایا، مولانا نے نماز شروع کی، تحریمہ باندھا لیکن قرات کرنے کے بجائے یہی شعر ان کی زبان پر آیا، اس کے بعد وہ بے ہوش ہوگئے، جب اپنے ہوش میں آئے تو شیخ شیوخ العالم نے فرمایا پھر امامت شروع کرو اور حاضر رہو۔"

راحۃ القلوب پر اسی قسم کے کمزور اعتراضات ہیں، مثلاً شروع ہی میں کہا گیا ہے کہ اس میں باتیں

فوائد الفواد سے لی گئی ہیں :

"It contains matters taken from Fawaid ul-Fuwad"

لیکن پھر فوراً ہی یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اس کے مرتب کی رسائی براہ راست فوائد الفواد تک نہیں ہوئی۔

"The author does not borrow directly from Fawaid Fuwad which seems to have been out of his reach."

طرز استدلال یہ ہے کہ اگر کوئی روایت فوائد الفواد سے ملی جلی ہے تو اس کو سرقہ قرار دیا جاتا ہے لیکن کوئی روایت فوائد الفواد سے کچھ مختلف ہے تو اس کو جعلی قرار دیکر رد کرنے کی تلقین کیجاتی ہے۔

راحۃ القلوب کو جعلی بنانے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ فوائد الفواد اور خیر المجالس کے بیان کے مطابق حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کو اجودھن کی تیسری بار کی حاضری میں خلافت ملی لیکن راحۃ القلوب میں پہلی بار ہی کی حاضری میں خلافت ملنے کا ذکر ہے، ایسا سمجھنا صحیح نہیں، راحۃ القلوب کے آغاز میں جو باتیں لکھی گئی ہیں اس کو در اصل تمہید سمجھنا چاہیے، جس میں خلافت کا بھی ذکر آگیا ہے لیکن یہ ذکر مجلس اول ہی کے سلسلہ میں کر دیا گیا ہے، اس لیے یہ التباس پیدا ہوگیا ہے، پھر مختلف مجلسوں میں ۶۵۵ھ کا ذکر ہے، لیکن یہ سنہ بھی یقیناً کتابت و طباعت کی فروگذاشت ہے، کیونکہ ان تاریخوں میں جو واقعات لکھے گئے ہیں، ان میں تطبیق نہیں ہوتی۔ اگر محنت کیجائے تو یہ تاریخیں معلوم ہوسکتی ہیں، میری ذاتی رائے ہے کہ یہ تمام مجلسیں حضرت خواجہ کی آخری بار (یعنی ۶۶۳ھ) کی حاضری کے موقع کی ہیں، اگر ہر مجلس کے ساتھ یہ سنہ لکھ دیا جائے، یا خیر المجالس کی طرح سنہ اور تاریخ کا ذکر ہی نہ کیا جائے تو پھر واقعات میں کوئی سقم پیدا نہیں ہوتا، پروفیسر صاحب کو سنہ کے غلط اندراجات کی وجہ سے ہر قسم کی غلطیاں نکالنے کا موقع مل گیا ہے، لیکن نفس واقعہ میں کوئی غلطی نہیں، مثلاً اس میں شیر خاں (المتوفی ۶۶۳ھ)

شیخ بہاء الدین زکریا (المتوفی ۶۶۲ھ) اور شیخ سیف الدین باخرزی (المتوفی ۶۵۸ھ) کی وفات کا ذکر ہے، اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ ملفوظات ان بزرگوں کی وفات کے بعد مرتب ہوئے تو پھر صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس میں سنہ کا جو اندراج ہے، وہ غلط ہے، لیکن مخالفانہ تنقید ہی میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ اس سنہ میں ان بزرگوں کی وفات نہیں ہوئی، اسلیے پورا مجموعہ جعلی اور فرضی ہے۔

راحۃ القلوب میں اسرار الاولیاء کی طرح حضرت فریدالدین گنج شکر کے مختلف مقامات کی سیاحت کا ذکر ہے، پروفیسر صاحب اس کو تسلیم نہیں کرتے، لیکن تسلیم نہ کرنے کے اسباب پر ہم نے جو کچھ پہلے لکھا ہے وہ ناظرین کی نظروں سے گذر چکا ہے۔

اسرار الاولیاء ہی کی طرح راحۃ القلوب پر یہ اعتراض ہے کہ خواجہ حسن بصری اور ذوالنون مصری کے مریدوں (disceples) اور حضرت بابا گنج شکر کی ملاقاتوں کا ذکر تعجب خیز ہے، کیونکہ دونوں کے زمانہ میں بڑا تفاوت ہے، لیکن اس سلسلہ میں پروفیسر صاحب سے جو فروگذاشت ہوئی ہے اس کی ۔۔ت توجہ مبذول کرانے کی ضرورت ہے، راحۃ القلوب (ص ۴۲) کی ایک عبارت ہے:

"پیر باعظمت صد و پنجاہ سال عمر او بود از نبیگاں خواجہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ۔"

اس کا ترجمہ پروفیسر صاحب نے انگریزی میں یہ کیا ہے:

A mystic .. who was one hundred and fifty years old and was a discipls of Kha Khawja Hasan Basari.

پیر باعظمت کو پروفیسر صاحب نے خواجہ حسن بصری کا مرید بتایا ہے، حالانکہ وہ نبیگان میں تھے، نبیگان سے مراد پوتوں پڑپوتوں کی اولاد بھی ہے، پھر مرید بتا کر تفاوت زمانہ دکھانا صحیح نہیں ہے۔

اسی طرح راحۃ القلوب (ص ۱۰) میں ہے:

"من از نبیگان خواجہ جنید بغدادی ہستم"

راحۃ القلوب (ص ۱۷) میں ہے۔

"عبد الواحد نبیسہ شیخ ذوالنون مصری قدس اللہ سرہ العزیز"

ان دونوں عبارتوں میں نبیگان اور نبیسہ کا ترجمہ مرید ہی کیا گیا ہے، جس سے راحۃ القلوب سے خواہمخواہ سوءِ ظن پیدا ہو جاتا ہے، راحۃ القلوب (ص ۴) کے حسب ذیل بیان پر جو اعتراض ہے، اس سے بھی سوءِ ظن پیدا کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

"شیخ بدر الدین غزنوی و شیخ جمال الدین ہانسوی و مولانا شرف الدین نبیسہ قاضی حمید الدین ناگوری نیز حاضر بود۔"

پروفیسر صاحب اس پر اعتراض کرتے ہیں،

In majlis No II (16 shaban 655 A.H) both Shaikh Budruddin Ghaznawi and Qazi Hameeduddin Nogori are declared to have been present ... as a matter of fact thay had both died several years before Nizamuddin Awliya reached Ajodhan. They could not have been thire with him.

شرف الدین نبیسۂ قاضی حمید الدین ناگوری کو قاضی حمید الدین ناگوری بتانا محض غلط فہمی پیدا کرنا ہے، پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ شیخ بدر الدین غزنوی کی ملاقات حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء سے نہیں ہوئی،

ایک اور مثال ملاحظہ ہو، راحۃ القلوب (ص ۵۶) میں ہے:

"شیخ الاسلام فرمود ابو طالب مکی در قوت القلوب می نویسد"

لیکن پروفیسر صاحب کا الزام یہ ہے کہ راحۃ القلوب میں قوت القلوب خواجہ عثمان ہارونی کی تصنیف بتائی گئی ہے، لیکن اوپر کی سطر سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی ہے،

ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو، راحۃ القلوب (ص ۶۱) میں ہے:۔

"چند روز یہ دعا گو ہانسی جا کر شیخ محمد ہانسوی کے پاس رہا ہے، جو شیخ قطب الدین بختیار اوشی قدس اللہ سرہ العزیز کے یاروں میں سے تھے، اور جب واپس آکر پابوسی کی تو حکم ہوا کہ بیٹھ جاؤ، میں بیٹھ گیا، ایک خط جو شیخ برہان الدین نے دیا تھا، پیش کیا، اس کا مطالعہ فرمایا، اس کے بعد فرمایا کہ تم نے دیر کی، بندہ نے زمین بوسی کی، اور کہا کہ تن خاکی تو وہاں تھا لیکن دل یہاں تھا، مخدوم بندہ نواز نے فرمایا ایسا ہی تھا، جیسا کہ تم کہتے ہو، تم پر بارہا میرا اشتیاق غالب آیا، اور تم کہتے ہو کہ اگر مجھکو پر ہوتا تو اڑ جاتا اور خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوتا، اور ان سے ملتا، اس کے بعد لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ شیخ کے مرید اور فرزند کو اسی طرح ہونا چاہیے جس طرح کہ مولانا نظام الدین ہیں، فرمایا کہ انھوں نے مجھکو ایک خط لکھا تھا، اس میں پابوسی کا بڑا اشتیاق تھا، اس میں ایک شعر بھی تھا، اس کو میں نے یاد کر لیا ہے، اور جب تم کو یاد کرتا ہوں تو یہ شعر پڑھتا ہوں، یہ بہت ہی بے نظیر ہے، اگر تم پڑھو تو میں سنوں، میں تسلیم بجا لایا اور یہ شعر پڑھا

زانگاہ کہ بندہ تو دانند مرا   بر مردمک دیدہ نشانند مرا
لطف عامت عنایتے فرمودہ است   ورنہ چہ کسم از کجا دانند مرا

میں نے جب یہ پڑھا تو شیخ الاسلام پر رقت طاری ہو گئی، اٹھے اور رقص فرمانے لگے، اتنا رقص فرمایا کہ اس کی حد نہ رہی، صبح سے دوپہر تک رقص فرماتے رہے، جب رقص ختم ہوا

تو اپنا خرقہ خاص مرحمت فرمایا، اور اسی روز عصا بھی عنایت فرمایا، مصلیٰ اور نعلین چوبی بھی دے"

فوائد الفواد (ص ۱۸۰) میں ہے:

"ایک بار میں نے ایک عرضداشت شیخ الاسلام فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں بھیجا تھا، جس میں یہ رباعی لکھ بھیجی تھی

زاں روئے کہ بندۂ تو دانند مرا   بر مردمک دیدہ نشانند مرا
لطف عامت عنایتے فرمود است   ورنہ چہ کسم خلق چہ دانند مرا

اس کے بعد شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس رباعی کا ذکر کیا اور فرمایا کہ میں نے اس کو یاد کر لیا ہے۔

دونوں میں کوئی تضاد نہیں، صرف تفصیل اور اجمال کا فرق ہے، لیکن پروفیسر صاحب کا یہ اعتراض ہے کہ اگر ہم فوائد الفواد کا مطالعہ کریں تو یہ پتہ چلے گا کہ خط کے ساتھ رباعی شیخ نظام الدین نے دہلی سے بھیجی تھی، اور غالباً دوسری آمد کے بعد بھیجی، یہ اعتراض کہاں تک صحیح ہے، خود ناظرین غور کریں، راحۃ القلوب کی عبارت سے یہ ظاہر ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء نے ایک خط میں یہ رباعی لکھ کر بھیجی تھی،

پروفیسر صاحب کا یہ اعتراض ہے کہ راحۃ القلوب کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء اجودھن کے قیام میں خانقاہ جایا کرتے تھے، حالانکہ وہ خانقاہ ہی میں مرشد کے ساتھ مقیم تھے، ان سے درس لیتے تھے، دن میں کئی بار ان سے ملتے، شاید پروفیسر صاحب کو غلط فہمی اس لیے ہوئی ہو کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے قلم سے ہر مجلس کے شروع میں حسب ذیل فقرے لکھے گئے ہیں:

"دولت پاے بوس حاصل شد ...... دولت پائے بوس میسر شد ...... سعادت پاے بوس میسر شد ...... دولت قدم بوس حاصل شد ...... سعادت قدم بوسی حاصل شد ......

یہ تو لکھنے کا ایک مودبانہ طریقہ تھا، ان فقروں سے یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء

اپنے مرشد سے الگ رہتے تھے، ساتھ رہنے کے باوجود احتراماً یہ فقرے لکھا کرتے تھے، پھر فوائد الفواد
کے حسب ذیل فقرہ پر تو وہی اعتراض وارد ہوتا ہے جو پروفیسر حبیب صاحب موصوف راحۃ القلوب پر کرتے ہیں۔

"خواجہ فرمود ہرچہ از شیخ شنودہ شد نوشتم چو بمقام خود باز آمدم بر جائے نسخہ کردم"۔

یعنی وہ خانقاہ کی مجلس میں جو کچھ سنتے لکھ لیتے، پھر اپنی قیام گاہ پر آکر اس کو ترتیب دیتے، اس سے
ظاہر ہے کہ ان کی قیام گاہ حضرت فرید الدین گنج شکر کی جائے رہائش سے مختلف تھی۔

راحۃ القلوب (ص ۲۹) میں ہے:۔

"یہ حکایت بیان فرما رہے تھے کہ ایک درویش شہاب الدین غزنوی آئے، وہ شیخ
الاسلام کے مریدوں میں سے تھے، قدم بوسی کی، حکم ہوا کہ بیٹھ جاؤ، وہ بیٹھے، اس درویش کو
والی لاہور نے کم و بیش سو دینار دیکر شیخ الاسلام کے پاس بھیجا تھا، شیخ الاسلام
نے فرمایا اے درویش! جو کچھ تمھارے پاس ہے، لاؤ، انھوں نے پچاس دینار شیخ الاسلام کی خدمت
میں پیش کیے، شیخ الاسلام نے تبسم فرماکر فرمایا کہ شہاب تم نے بھائیوں کی اچھی تقسیم کی لیکن درویشوں
کے لیے اس قسم کی بات اچھی نہیں، وہ بہت شرمندہ ہوئے، فوراً سو دینار شیخ الاسلام کو
پیش کر دیے، شیخ الاسلام نے فرمایا کہ اگر میں تم کو اس قسم کی بات نہ کہتا تو تم اس کام میں بھٹک
جاتے، اس طرح تم درویشوں کے مقصد کو حاصل نہ کرتے، پھر سو دینار ان کو دیدیے، اور
فرمایا کہ پھر سے بیعت کرو، بیعت میں خلل پڑ گیا"۔

فوائد الفواد میں یہ روایت اس طرح درج ہے کہ حضرت فرید الدین گنج شکر کے خلفاء کا ذکر تھا تو حضرت
خواجہ نظام الدین نے فرمایا:

"ان میں ایک ایسے درویش بھی تھے، جن کو عارف کہا جاتا تھا، ان کو سیوستان کی طرف بھیجا
اور بیعت کی اجازت بھی دی، واقعہ یہ ہوا کہ ایک ملک اوچ اور ملتان کی طرف تھا، یہ درویش

اس ملک کے امام تھے، دونوں کچھ باہمی تعلقات بھی رکھتے تھے، ایک بار اس ملک نے سو تنگے
اس عارف کو دیے، اور شیخ الاسلام شیخ فرید الدین قدس اللہ سرہ العزیز کے پاس بھیجا، انھوں نے
پچاس تنگے تو اپنے پاس رکھ لیے اور پچاس شیخ کی خدمت میں پیش کیے، شیخ نے تبسم فرمایا اور کہا

"قسمت برادر وار کردی"

وہ عارف شرمندہ ہوئے اور اپنے پاس جو پچاس تنگے رکھے ہوئے تھے، ان کو شیخ کی خدمت
میں پیش کیے، اور بڑی عاجزی کی، معذرت کی، پھر ارادت کے لیے التماس کیا، شیخ نے
اپنے ہاتھ پر بیعت کرلیا، اور وہ محلوق ہوگئے، اس کے بعد وہ اتنے راسخ العقیدہ ہوگئے کہ پوری
استقامت سے ساری چیزیں حاصل کرلیں، اور بالآخر شیخ نے ان کو بیعت کی بھی اجازت دی
اور سیوستان کی طرف بھیجا۔ (ص ۱۴ - ۲۱۵)

سیر الاولیاء میں فوائد الفواد ہی سے یہ روایت لی گئی ہے، لیکن فوائد الفواد کی مذکورہ روایت
نقل کرکے اسکے مولف نے یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ مولانا عارف کو خلافت نامہ ملا تو انھوں نے شیخ الشیوخ حضرت
فرید الدین سے کہا کہ وہ اس کام کے لائق نہیں ہیں، اور جو کام مشائخ کبار کرتے رہے ہیں، وہ ان سے
نہ ہوگا، لیکن شیخ نے ان پر شفقت فرمائی، اس کے بعد وہ شیخ الشیوخ عالم کی اجازت سے کعبہ گئے،
جہاں سے واپس نہ ہوئے، یہ اضافہ اس لیے الحاقی نہیں سمجھا جاسکتا کہ یہ فوائد الفواد میں نہیں ہے۔

اب راحۃ القلوب اور فوائد الفواد کی اس روایت میں جو اختلاف ہے وہ نام کا اختلاف
ہے، راحۃ القلوب میں نام شہاب الدین غزنوی اور فوائد الفواد میں عارف بتایا گیا ہے، راحۃ القلوب
میں ہے کہ وہ پہلے ہی سے حضرت شیخ فرید الدین کے مرید تھے، لیکن فوائد الفواد میں ہے کہ وہ بعد میں مرید
ہوئے، راحۃ القلوب میں ہے کہ والی لاہور نے بھیجا، لیکن فوائد الفواد میں مبہم طریقہ پر بتایا گیا ہے کہ ملک
اوچ اور ملتان کی طرف تھا، لیکن اس جزوی اختلاف سے کتاب کے جعلی اور فرضی ہونے کا ثبوت

فراہم نہیں ہوتا، اس قسم کے اختلافات تذکروں میں بہت ملتے ہیں، ممکن ہے کہ ملفوظات کے مرتب کو لکھنے میں سہو ہو گیا ہو، لیکن یہ احتمال دونوں مجموعوں کے لیے ہو سکتا ہے، اور اگر یہ صحیح ہے کہ راحۃ القلوب کی یہ روایت فوائد الفواد سے سرقہ ہے تو پھر اس سرقہ میں نام کا بدل دینا سمجھ میں نہیں آتا۔

راحۃ القلوب میں ہے:۔

"بعد ازاں ہمد ریں محل فرمود کہ وقتے قاضی حمید الدین ناگوری و شیخ قطب الدین بختیار اوشی و شیخ جمال الدین تبریزی و شیخ بدر الدین غزنوی قدس اللہ سرہم العزیز در مسجد جامع دہلی چند روز معتکف شدند۔" (ص ۴۵)

پروفیسر صاحب اس روایت کو فرضی قرار دیتے ہیں، اور وجہ یہ بتاتے ہیں کہ فوائد الفواد کے بیان کے مطابق حضرت جلال الدین تبریزی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے صرف دو ملاقاتیں ہیں ایک کیلو کھری کی سرحد پر اور دوسری ملک عزیز الدین بختیار کی مسجد میں ہوئیں (فوائد الفواد ص ۱۵۰) فوائد الفواد سے جامع مسجد میں دونوں کا معتکف ہونا ثابت نہیں، اول تو مذکورہ عبارت کے جمال الدین تبریزی کو واقعی جلال الدین تبریزی سمجھا جائے، تو اس میں اسماء کی کتابت و طباعت کی غلطیوں کا ایک ثبوت اور فراہم ہو جاتا ہے، اس میں صرف مسجد کے نام کا فرق ہے۔ فوائد الفواد میں ہے

"وقتے در مسجد ملک عزیز الدین بختیار کہ ہم پیش گرمابہ او است ہر دو بزرگ یکجا شدند۔" (ص ۱۵۱)

یکجا شدند کے اجمال میں ممکن ہو کہ دونوں اسی مسجد میں معتکف ہوئے ہوں، صرف نام کے اختلاف سے پوری عبارت فرضی نہیں قرار دی جا سکتی ہے۔

راحۃ القلوب (ص ۱۸) میں ہے:۔

"بعد ازاں فرمود کہ وہمیں ملا ومغل نازل شد ہمیں را گرد گرفتند۔"

اعتراض یہ ہے کہ یمن پر مغلوں کا حملہ کبھی نہیں ہوا، معلوم نہیں یہ کتابت کی غلطی ہو یا واقعی مغل ہو

اگر مغل ہے تو میری رائے ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان میں مغلوں کے اتنے حملے ہوئے کہ ہر جگہ کے حملہ آور کو مغل ہی کہا جانے لگا۔ اگر یہ غلطی ہے تو محض ایک فروگذاشت ہے جس کی بنا پر پوری کتاب رد نہیں کیجا سکتی۔

اس قسم کی اور فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلا کر پروفیسر صاحب رقمطراز ہیں کہ راحۃ القلوب میں اتنے اوراد و وظائف کا ذکر آیا ہے کہ اس کی تدوین کا مقصد ان ہی اوراد و وظائف کو نمایاں کرنا تھا، لیکن اگر ان کو نمایاں کیا گیا ہے تو یہ اس کے جعلی ہونے کی کوئی دلیل نہیں بن سکتی۔ پروفیسر صاحب کے نزدیک سیر الاولیا بڑی مستند کتاب ہے، اس میں اوراد و وظائف کا ذکر راحۃ القلوب سے زیادہ ہے، رہروان سلوک کی اکثریت ایسی ہی ہے کہ ان کو بزرگان دین کی کتابوں میں تاریخی، سیاسی اور معاشرتی معلومات سے زیادہ اوراد و وظائف ہی کی تلاش ہوتی ہے، کیونکہ ان ہی کے ذریعہ سے ان کی روحانی تسکین ہوتی ہے، لیکن پروفیسر صاحب اس کو سستے قسم کا صوفیانہ لٹریچر قرار دیتے ہیں۔

خیر المجالس کی روایت کے مطابق مذکورۂ بالا ملفوظات کو مشکوک سمجھ کر ان میں غلطیوں کی نشاندہی کرنا ایک حد تک صحیح سمجھا جا سکتا ہے، لیکن افضل الفوائد کو بھی فرضی اور جعلی قرار دینا تعجب انگیز ہے، اب تک امیر خسرو پر جتنی کتابیں لکھی گئیں ان میں ان کی تصانیف کا سیر حاصل ذکر ہے، لیکن کسی نے ان کی افضل الفوائد کو جعلی اور فرضی قرار نہیں دیا ہے،

افضل الفوائد پر بنیادی اعتراض یہ ہے کہ اس کا طرز انشا خزائن الفتوح، اعجاز خسروی اور دواوین کی تمہیدوں سے مختلف ہے، لیکن ایک ایسا قادر الکلام شاعر اور نثر نگار جو تمام اساتذۂ فن کی تقلید کر سکتا ہے، اور اعجاز خسروی لکھنے کے ساتھ ہندی میں عورتوں کیلئے گیت اور بچوں کیلئے مکرنیاں اور پہیلیاں لکھ سکتا ہے اسکے لیے افضل الفوائد کی ایسی سلیس عبارت لکھنا کوئی مشکل کام نہیں، اور خصوصاً جبکہ ایک کہی ہوئی چیز کو صرف نقل کر دینا ہو۔

امیر خسرو پر سب سے زیادہ مستند کتاب ڈاکٹر وحید مرزا کی ہے۔ ان کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ نہ آیا کہ افضل الفوائد ایک جعلی تصنیف ہے، بلکہ وہ لکھتے ہیں،

"یہ کتاب میر حسن کی عظیم تصنیف فوائد الفواد کی بظاہر تقلید میں لکھی گئی، اس لیے یہ کتاب اعجاز خسروی یا خزائن الفتوح سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی زبان بہت ہی سادہ، سلیس اور لفظی صنائع کی زینت سے بالکل پاک ہے، اور یہ اس زمانہ میں جو فارسی زبان بولی جاتی تھی اس کا عمدہ نمونہ ہے۔" (ص ۴۴۷)

پروفیسر صاحب موصوف افضل الفوائد کی حسب ذیل تحریروں کو سستے قسم کا صوفیانہ لٹریچر بنا کر جعلی قرار دیتے ہیں:

"آنگاہ ملائم ایں معنی فرمود کہ ہمانجا در اوراد خواجہ یعنی شیخ الاسلام خواجہ عثمان ہرونی دیدم ہم باسناد ابوہریرہ کہ او گفت کہ ہر کہ روز یکشنبہ چہار رکعت نماز بگذارد و بخواند در ہر رکعتے الحمد یک بار، و آمن الرسول یک بار فرماید ایزد تعالیٰ بنویسد در نامۂ اعمال او بعدد ہر ترسائی و ترسایہ عبادت یکسالہ را و ثواب ہزار غزا و ثواب ہزار پیغمبران و ثواب شہیداں را دہد و بہ ہند و میان او و میان دوزخ چنداں مسافت بود ہزار خندق درمیاں بود پہنائے ہر خندق پانصد سالہ راہ باشد و بکشاید ایزد تعالیٰ بروہشت بہشت را۔"

(قلمی نسخہ دار المصنفین ص ۲۲)

پروفیسر صاحب کو اعتراف ہے کہ اس قسم کی تحریریں بعد کی کتابوں میں تو بہت ہیں، لیکن حضرت نظام الدین اولیاء اور شیخ نصیر الدین چراغ کے مستند ملفوظات اور ان سے پہلے کے صوفیہ کی کتابوں میں نہ ملیں گی، لیکن فوائد الفواد میں سورۂ یٰسین (ص ۶۰) اور صلوٰۃ البروج کی جو فضیلت بتائی گئی ہے، وہ شاید پروفیسر صاحب کی نظر سے نہیں گذری، جس طرح سورۂ یٰسین پڑھ کر امام ناصری مر کر اور دفن ہو جانے کے بعد قبر سے باہر زندہ نکل آئے، اس کی تفصیل تو فضل الفوائد کی روایتوں سے زیادہ حیرت انگیز ہے، سیر الاولیاء کے باب ہفتم میں ادعیۂ ماثورہ اور

اوراد مقبولہ کی بڑی تفصیلات ہیں، ان میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے:

"می فرمود جعفر خالدی رحمۃ اللہ علیہ را نگینہ بود روزے در کشتی سوار شد، خواست کہ ملاح را چیزے بدہد چوں جامہ باز کرد آن نگینہ در دجلہ افتاد و بردو دعائے بود مجرب آں دعا را می خواند وقتے کتابے را مطالعہ می کرد، درمیان اوراق آن نگینہ یافت دعا این است یا جامع الناس! لیوم لا ریب فیہ اجمع علی ضالتی۔" (ص ۴۲۸)

افضل الفوائد کے آغاز میں حضرت امیر خسرو کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کی تفصیل ہے لیکن اس سے پہلے مجلس اول کی تاریخ ذی الحجہ ۷۱۳ھ مرقوم ہے، اس سے التباس ہوتا ہے کہ اسی تاریخ میں امیر خسرو بیعت ہوئے، حالانکہ یہ تمہیدی تعارف ہے، اگر اس تعارف کے بعد مذکورۂ بالا تاریخ لکھی جاتی تو کوئی اعتراض نہ ہوتا، لیکن یہی اعتراض راحۃ القلوب میں کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتب روایت کے مطابق مجلس اول کے ملفوظات قلمبند کرنے سے پہلے اپنے بیعت ہونے کا ذکر کر دینا ضروری سمجھتے تھے۔ اس کے بعد یہ اعتراض جاتا رہتا ہے، کہ امیر خسرو نے اس مجموعہ میں ۷۱۳ھ میں بیعت ہونے کا ذکر کیا ہے، حالانکہ وہ اس سے بہت پہلے حلقۂ ارادت میں داخل ہو چکے تھے۔

افضل الفوائد کی حسب ذیل دو روایتیں ضرور قابل تنقید ہیں، اس کی مجلس ۲۵ میں ہے:

"ہم دریں محل فرمود کہ از زبان شیخ نجم الدین صغریٰ شنیدہ ام۔" (ص ۱۵۴ قلمی نسخہ)

پھر مجلس ۲۶ میں ہے:

"فرمود چوں حق تعالیٰ خواست کہ حجاج را بہ بلا مبتلا کند آخریں کسے را کہ کشت برادر ابو السعید بن ابو الخیر بود،

پروفیسر صاحب کا اعتراض ٹھیک ہے کہ شیخ نجم الدین صغری کی وفات شمس الدین التمش کے عہد میں ہو گئی تھی، لیکن اس سلسلہ کی پوری عبارت پیچیدہ قسم کی ہے۔

"دریں محل فرمود کہ از زبان شیخ نجم الدین صغرا شنیدہ ام کہ در مثال علی فرمودہ کہ بنشستہ دیدہ ام ذکر الاولیا عبادت یعنی ذکر اولیا عبادت است و در ذکر ایشان ثواب عبادۃ در نامۂ دنبولیسد" (ص ۹۵)

کسی اور قلمی نسخہ کا موازنہ کیا جائے تو پیچیدہ عبارت کی وضاحت ہو سکتی ہے، پھر اعتراض یہ ہے کہ ابو سعید بن ابو الخیر اور حجاج کے زمانہ میں بڑا تفاوت ہے، حجاج کا برادر ابو سعید بن ابو الخیر کا قتل کرانا بعید از قیاس ہے، لیکن یہ تاریخی حقیقت ہے، کہ حجاج نے سعید بن جبیر کو قتل کرایا (تفصیل کے لیے دیکھو تابعین (ص ۱۳۵) شائع کردہ دار المصنفین) اس طرح برادر ابو سعید بن ابو الخیر کا نام محض کتابت کی غلطی ہے، اسی طرح نجم الدین صغرا میں بھی کتابت کی غلطی ہو گئی ہوگی، اسی کے ساتھ یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ ان ناموں میں جو غلطیاں ہیں، وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے بیان کرنے یا مرتب کے لکھنے یا کاتب کی کتابت کرنے کی غلطیاں ہیں، ان معمولی فروگذاشتوں سے پوری کتاب کو جعلی قرار دینا محض ظلم ہے، ایسی غلطیاں اچھے اچھے مورخوں سے بھی ہوا کی ہیں۔

پروفیسر صاحب کا اعتراض ہے کہ افضل الفوائد میں شیخ معین الدین، شیخ فرید الدین، شیخ بہاء الدین زکریا کے اوراد، پھر انیس الارواح، حضرت شیخ فرید الدین کے بخارا کی سیاحت کا بھی ذکر ہے، جو جعلی ملفوظات سے لیے گئے ہیں، لیکن جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، کہ افضل الفوائد کو جعلی مجموعہ نہ سمجھنے والے ان حوالوں کو مزید سند کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں، کہ راحۃ القلوب اور اسرار الاولیاء میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ فرضی نہیں، بلکہ اس کی تائید افضل الفوائد سے بھی کی جا سکتی ہے،

افضل الفوائد میں پیغمبروں کے جو قصے لکھے گئے ہیں ان کے لیے قصص الانبیاء کو حوالہ دیا گیا ہے، اعتراض ہے کہ قصص الانبیاء بعد کی تصنیف ہے، لیکن قصص الانبیاء کے نام سے ہر زمانہ میں کتابیں لکھی گئی ہیں، بعد کی قصص الانبیاء کی کتابوں سے غلط ملط کرنا صحیح نہیں، حضرت خواجہ سے پہلے وہب بن منبہ (المتوفی ۱۱۴ھ) علی بن حمزہ کسائی (المتوفی ۱۸۹ھ) سہل بن عبداللہ (المتوفی ۲۸۳ھ)

ابن جوزی (المتوفی ۵۹۷ھ) نے اس نام سے کتابیں لکھیں۔

اعتراض ہے کہ فوائد الفواد میں حلاج منصور کی جو تصویر ہے، وہ افضل الفوائد سے مختلف ہے، لیکن میرے نزدیک کچھ زیادہ فرق نہیں، افضل الفوائد میں ہے:

"ہم دریں محل فرمود کہ وقتے بزرگے بر سر قبر خواجہ منصور حلاج رسید بایستاد و گفت، می دانید کہ ایں روضہ کیست ہمہ اصحاب ا گفتند نداشیم گفت ایں روضہ منصور دیوانہ است کہ ہم در یک جرعہ چناں از دست شد کہ طاقت خود کہ سر را نگاہ دارد و چوں کشف کرد، کشتہ شد بس اے یاران ہمچنیں است کہ سر بادشاہاں کشف کند سزائے اوایں بود کہ منصور یافت" (ص ۲۲ قلمی نسخہ)

البتہ مقام محبت کے سلسلہ میں منصور کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"زہے صادق کہ اول روز بکشند، دوم روز بسوزند، سوئم روز در آب رواں اندازند آنگاہ مناسب حال ایں رباعی بر زباں راند"

آں روز مباد کز تو بیزار شوم	با دیگرے در یں جہاں یار شوم
گر بر سر کوئے تو مرا دار کنند	من رقص کناں بر سر آں دار شوم

افضل الفوائد کی اس روایت میں جو کیفیت ہے وہ فوائد الفواد سے مختلف نہیں،

فوائد الفواد (ص ۲۵۴) میں ہے:

بندہ عرضداشت کرد کہ سیدی احمدی چگونہ کسے بود فرمود بزرگ کسے بود از عرب است و ہم عرب آنست کہ چوں کسے را بہ بزرگی یاد کنند سیدی گویند فرمود کہ در عہد شیخ حسین منصور حلاج بود رحمۃ اللہ علیہما، در انچہ حسین منصور بسوختند و خاکستر اور ادر آب دجلہ رواں کردند، سید احمد قدرے از اں آب کہ در و خاکستر بود، بہ تبرک بر داشت و بخورد و آں ہمہ برکتہا از آنجا بود۔"

اس عبارت میں منصور حلاج کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہا بھی ہے، پھر یہ کہ حضرت خواجہ ان کی خاکستر کو باعث برکت بھی سمجھتے تھے، جس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت خواجہ کے نزدیک وہ مبغوض اور مردود نہ تھے، جیسا کہ پروفیسر صاحب نے اپنے اعتراض میں ظاہر کیا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مولانا محی الدین کاشانی سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے خلافت نامہ اس لیے واپس لے لیا کہ انھوں نے اودھ کے قاضی کا عہدہ قبول کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن اس سے قاضی کے منصب کی اہمیت کم نہیں ہوتی، اور حضرت خواجہ کی زبانی افضل الفوائد میں جو حسب ذیل ملفوظ ہے، اس میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوتا،

"سخن در قاضیاں افتادہ بود، بر لفظ مبارک راند کہ قاضی و قضا نیکو چیزے است اگر کسی براند وحق آں کند و بجا آرد کہ آں قائم مقام حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم۔" (ص ۳)

مفتاح العاشقین پر اعتراض ہے کہ اس کی روایتیں فوائد الفواد اور خیر المجالس سے مسروقہ ہیں، گو اسی کے ساتھ یہ متضاد بات بھی لکھی گئی ہے، کہ اس کے مرتب نے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا گویا پڑھا بھی ہے، اور نہیں بھی پڑھا ہے،

ایک ہی بزرگ کی روایت ان کے ملفوظات کے دو مجموعوں میں ہونا بعید از قیاس نہیں، ممکن ہے کہ یہ دو موقعوں پر کہی گئی ہو، جو دو مختلف مرتبوں نے علیحدہ علیحدہ قلم بند کرلی ہو، پھر کسی روایت کا کسی دوسری کتاب میں دہرایا جانا سرقہ کی دلیل نہیں، خیر المجالس میں بہت سی ایسی روایتیں ہیں جو فوائد الفواد سے لی گئی ہیں، مثلاً خیر المجالس میں شیخ ابوسعید ابو الخیر اور ان کی صاحب جمال لڑکی (ص ۴۴) یا شیخ جلال الدین تبریزی اور قاضی جمال الدین جعفری (ص ۲۱) یا شیخ نجم الدین کبری سے حضرت شیخ سیف الدین باخرزی کی ارادت (ص ۱۸ - ۱۸۰) کی جو روایتیں بیان کی گئی ہیں، وہ فوائد الفواد (ص ۱۸ - ۲۱۲ - ۲۵۶) میں بھی ہیں، صرف اجمال یا تفصیل یا تھوڑے الفاظ کے رد و بدل کا فرق ہے

پروفیسر خلیق احمد نظامی نے خیر المجالس کے انگریزی دیباچہ (ص ۱۱) میں جوامع الکلم کی ایسی روایتوں کی ایک لمبی فہرست دی ہے، جو خیر المجالس میں ہیں، کیا یہ توارد و تکرار خیر المجالس اور جوامع الکلم کے جعلی اور فرضی ہونے کی دلیل بن سکتی ہے؟

مفتاح العاشقین کے جعلی ہونے کی یہ بھی دلیل پیش کی گئی ہے کہ اس میں شیخ معین الدین اجمیری، شیخ عثمان ہارونی کے رسائل انیس الارواح اور دلیل العارفین جیسی جعلی کتابوں کے حوالے ہیں، لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ یہ دلیل تشفی بخش نہیں، کیونکہ ان ملفوظات میں ان کے حوالے کی موجودگی کی بنا پر خیر المجالس یا شیخ حمید قلندر کی روایت کے مشکوک ہونے کی دلیل میں پیش کیجا سکتی ہے،

اباحت سجدہ کے متعلق فوائد الفواد (ص ۱۵۹) پر یہ روایت ہے:

"ماضی کی امتوں میں سجدہ مستحب تھا، اسی لیے رعیت بادشاہ کو، شاگرد استاد کو اور امت پیغمبر کو سجدہ کرتی، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں سجدہ روک دیا گیا، اس لیے اس کا استحباب بھی ختم ہوگیا، لیکن اس کی اباحت باقی رہی، اگر مستحب نہیں ہے تو مباح ہے، جو چیز مباح ہے، اس پر نفی عائد نہیں ہوتی ہے، اس کی ممانعت کہاں سے آتی"

مفتاح العاشقین میں یہ روایت ہے:-

"اعتقاد سجدہ کے بیان کے سلسلہ میں فرمایا کہ حق سبحانہ تعالیٰ کے سوا سجدہ غیر کے لیے روا نہیں ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو غیر حق تعالیٰ کو سجدہ کرتا ہے کافر ہے، نعوذ باللہ منہا، لیکن پہلی امتوں میں سجدہ مستحب تھا، ماں، باپ، استاد، پیر اور سلاطین کو لوگ سجدہ کرتے تھے، لیکن حضرت رسالت پناہ کا زمانہ آیا تو سجدہ کا استحباب ختم ہوگیا، یہ مباح ہوگیا، جیسا کہ ایام بیض کا روزہ پہلے فرض تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ فرض نہیں رہا، مستحب ہوگیا اور جب سجدہ کا استحباب جاتا رہا، تو یہ مباح ہوگیا، اس سجدہ سے کوئی کافر نہیں ہوتا ہے۔" (ص ۴)

ان روایتوں میں کوئی ایسا اختلاف نہیں جس کی بنا پر مفتاح العاشقین سے سوء ظن پیدا کیا جائے، یہ اور بات ہے کہ علمائے ظاہر فوائد الفواد اور مفتاح العاشقین دونوں کی روایتوں کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھیں گے۔

مفتاح العاشقین کے جعلی ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس میں خواجہ قطب الدینؒ اور خواجہ معین الدینؒ کی غزلوں کا ذکر ہے، گو مفتاح العاشقین میں حضرت بختیار کاکی کی جو غزل نقل کی گئی ہے وہ ان کے نولکشور کے مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے، لیکن یہ تو تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں کہ حضرت خواجہ قطب الدین اور خواجہ معین الدین کے اسمائے گرامی سے جو دیوان منسوب ہیں وہ جعلی ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ تسلیم کرنا بھی ضروری نہیں کہ انھوں نے کوئی شعر یا غزل نہیں کہی، حضرت بدر الدین غزنوی اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء بھی کبھی کبھی شعر کہہ لیا کرتے تھے، (دیکھو فوائد الفواد ص ۱۵۰ - ۱۵۶) حضرت خواجہ جمال الدین ہانسوی نے بھی کچھ غزلیں کہی تھیں، حضرت بابا فرید گنج شکر کی طرف بھی کچھ فارسی، عربی اور پنجابی اشعار منسوب ہیں، (دیکھو دی لائف اینڈ ٹائمس آف شیخ فرید الدین گنج شکر از پروفیسر خلیق احمد نظامی ص ۸۶ - ۸۵، ۸۸)

اس طرح اگر خواجہ قطب الدین اور خواجہ معین الدین چشتی نے بھی کچھ اشعار کہہ دیے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، حضرت خواجہ معین الدین نے حضرت علی ہجویری کے مزار پر چلہ کرنے کے بعد جو شعر کہا وہ آج تک مشہور ہے، مفتاح العاشقین میں ان کی غزلوں کے جو حوالے آئے ہیں ان سے مجموعہ کے فرضی سمجھنے کے بجائے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خواجہ نصیر الدین کے عہد میں بھی ایسی غزلوں کی عام شہرت ہو گئی تھی، جو بزرگان چشت کے نام سے منسوب ہو گئی تھیں، آج بھی سماع کی محفلوں میں حضرت خواجہ عثمان ہارونی یا ہروانی کی ایک غزل گائی جاتی ہے، اور لوگوں کو یقین ہوتا ہے کہ یہ غزل انہی کی ہے، کوئی یہ کہکر اس کو گانے سے روک نہیں دیتا کہ یہ غزل انکی نہیں ہے، جہاں تک میری معلومات ہیں شاید کسی نے ابتک حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مطبوعہ نسخہ (نولکشور پریس) پر ابتک ناقدانہ نظر نہیں ڈالی ہے لیکن پروفیسر محمود شیرانی اور پروفیسر ... براہیم ڈار نے یہ بتایا ہے کہ دیوان خواجہ معین الدین مطبوعہ نولکشور پریس کی اکثر غزلیں مولانا معین الدین بن مولانا شرف الدین حاجی محمد الفراہی

کی تصانیف معارج النبوت اور تفسیر فاتحہ میں پائی جاتی ہیں، لیکن نولکشور پریس میں دیوان ۱۲۸۰ھ مطابق (۱۸۶۳ء) میں چھپا، اس سے پہلے خواجہ صاحب کی شاعری کے نمونے تذکرہ حسینی (۱۱۶۳ھ) مخزن الغرائب (۱۲۱۸ھ) اور مجمع الفصحاء میں پائے جاتے ہیں، جو اس کا ثبوت ہے کہ حضرت خواجہ کے بارے میں عام شہرت تھی کہ وہ شاعر بھی تھے اور اسی شہرت کی بنا پر ان کے نام سے ایک دیوان بھی منسوب ہو گیا۔

یہ اگر فرض کر لیا جائے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت فرید الدین گنج شکر نے اپنے اپنے پیروں کے ملفوظات مرتب نہیں کیے بلکہ جو ان کے نام سے منسوب ہیں وہ فرضی ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کے یہاں اپنے مرشدوں کے ملفوظات کو ترتیب دینے کی سنت اور روایت نہ تھی تو آخر خواجہ نظام الدین اولیاء نے فوائد الفواد اور حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی نے خیر المجالس مرتب کرانے کی بدعت کیوں جاری کی، گو یہ بدعت حسنہ ہی سہی، وہ تو اپنے خواجگان کے مسلک کے اتنے پابند تھے کہ سیر الاولیاء کی روایت کے مطابق حضرت فرید الدین نے زیارت خانہ کعبہ اس لیے نہیں کی کہ ان کے پیر نے نہیں کی تھی، اسی طرح وہ جاگیریں بھی قبول نہیں کرتے تھے اور سلاطین کے درباروں میں بھی نہیں جاتے تھے کہ یہ ان کے خواجگان کی رسم نہ تھی، تو آخر جب ملفوظات مرتب کرانے کی بھی رسم نہیں تھی تو خواجہ نظام الدین اولیاء کے زمانے سے یہ رسم کیوں قائم کی گئی۔

اگر یہ بدعت حسنہ نہ تھی تو پھر انیس الارواح، دلیل العارفین، فوائد السالکین اور راحۃ القلوب کے بیانات کے علاوہ افضل الفوائد، مفتاح العاشقین اور سیر الاولیاء میں ملفوظات قلم بند ہونے کی جو متواتر روایتیں ہیں، وہ لائق توجہ ہیں، ان کی خامیوں کے باوجود ان کے بین السطور میں جو کہیں کہیں کیفیت اور تاثیر ہے اور ان کے پڑھنے سے بعض اوقات جو ذہنی آسودگی اور روحانی تسکین ہوتی ہے، اور پھر ان میں اکثر جگہوں پر سلوک و معرفت کی جو باریکیاں اور موشگافیاں ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے ترتیب دینے والے ادنی درجہ کے مجاور نہیں ہو سکتے، اور یہ بھی باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ جعلی اور فرضی مجموعۂ ملفوظات کو

ترتیب دینے کی ایک مسلسل مہم جاری ہوئی جو ایک عرصۂ دراز تک قائم رہی،

اور اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ بزرگان چشت نے خود ان مجموعوں کو مرتب نہیں کیا تو یہ ماننے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیے کہ مجموعے قدیم العہد ضرور ہیں، جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ ان کے گہرے مطالعہ کے بعد اس رائے سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ ان میں تصوف کی بنیادی تعلیمات وہی ہیں جو فوائد الفواد اور خیر المجالس جیسی مستند اور معتبر کتابوں میں ہیں، اور ان کے معترضین کو بھی اعتراف ہے کہ یہ مجموعے فوائد الفواد اور خیر المجالس کی اکثر و بیشتر روایتوں کے سہارے تیار ہوئے، لیکن ان کی بعض باتوں کو محض اس لیے رد کر دینا کہ وہ ان دونوں کتابوں میں نہیں ہیں، ضرورت سے زیادہ تحقیقی سرگرمیوں کا اظہار کرنا ہے،

یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے بعض فرقوں کے اہل قلم تو فرضی ماخذ بنا کر اپنی تاریخ اور ماضی کو سنوار رہے ہیں اور ہمارے پاس جو سرمایہ موجود ہے ہم اسکو خود ہی فرضی قرار دیتے رہے ہیں،

اس طویل خامہ فرسائی کا مقصد یہ ہے کہ یہ ملفوظات ابتک نہایت لاپروائی سے چھپتے رہے، لیکن اگر ان کو محنت سے ایڈٹ کیا جائے اور ان میں سنین اور اسماء کی جو غلطیاں ہیں ان کی نشاندہی بہ لحاظ دانشوری کرکے درست کر دی جائیں تو یہ قدیم العہد ماخذ کے طور پر احتیاط سے استعمال کیے جاسکتے ہیں، جیسا کہ عہد ماضی میں بھی اہل قلم کرتے رہے ہیں، مثلاً شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو بھی ان ملفوظات کے معتبر ہونے میں کچھ شک تھا اور انھوں نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے اس قول کو بھی نقل کیا ہے، جس میں انھوں نے فرمایا ہے کہ

"شیخ نظام الدین می فرمود کہ من ہیچ کتابے نہ نوشتہ ام زیرا کہ شیخ الاسلام فریدالدین و شیخ الاسلام قطب الدین و از خواجگان چشت ہیچ شخصے تصنیف نہ کردہ است" (اخبار الاخیار ص ۸۶)

لیکن اس شبہہ کے باوجود وہ ملفوظات خواجگان کو ماخذ کے طور پر برابر استعمال کرتے رہے، کیونکہ ان کے حوالے وہ بار بار دیتے ہیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ذکر میں ہے :-

"در دلیل العارفین کہ خواجہ بختیار اوشی از ملفوظات خواجہ قدس سرہ جمع کردہ مذکور است..."

(ص ۲۲)

پھر حضرت بختیار کاکی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"در دلیل العارفین می نویسد ......" (ص ۲۵)

حضرت فریدالدین گنج شکر کے ذکر میں ہے :-

"بعضے از ملفوظات گنج شکر کہ بخط شیخ نظام الدین اولیا و با فوائد مکتوب می گردد" (ص ۵۲)

اور اگر محض شکوک و شبہات کی بنا پر ان ملفوظات کو جعلی سمجھ کر ان کو بالکل ہی رد کر دینے پر اصرار بڑھا تو ہم ایک ایسے قابل قدر علمی سرمایہ سے محروم ہو جائیں گے جس سے صدیوں تک حضرت عوام و خواص بلکہ اہل علم اور تذکرہ نگار بھی استفادہ کرتے آئے ہیں، اور اسی کے ساتھ روحانیت اور تصوف کے منکروں کو موقع فراہم کریں گے کہ وہ اپنی کوتاہ نظری، عیب جوئی، خردہ گیری اور بد عقیدگی سے کام لے کر فوائد الفواد اور خیر المجالس وغیرہ پر بھی نکتہ چینی کر کے ان سے سوء ظن پیدا کرا دیں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ کتابیں، ان کے لیے نہیں ہیں، جو

خرد نے مجھ کو عطا کی ہے نظر حکیمانہ

کے معترف ہیں بلکہ ان کے لیے ہیں، جو

سکھائی عشق نے مجھکو حدیث رندانہ

کے قائل ہیں، اور فرزانہ بن کر مقام شوق میں کھو گئے ہیں۔

حافظ ابن کثیرؒ

از جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دارالمصنفین

(۲)

حافظ ابن کثیرؒ کا اصل تصنیفی کارنامہ دو کتابیں تفسیر قرآن اور تاریخ البدایہ والنہایہ ہیں، ان کی بدولت ان کو شہرت دوام ملی، اور حقیقت میں یہ دونوں کتابیں ان کے علمی کمالات کا شاہکار اور علم و تبحر، وسعت مطالعہ اور بالغ نظری کا مکمل ثبوت ہیں، ان کی زندگی ہی میں ان کتابوں کو بڑا اعتبار اور حسن قبول حاصل ہوگیا تھا، اور ہر زمانہ کے اہل علم اور اصحاب نظر نے ان کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، ان دونوں کتابوں میں بھی تفسیر قرآن کو بوجوہ زیادہ اہمیت حاصل ہے، اس لیے پہلے اسکا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱

علماء اور اصحاب نظر نے اس کے متعلق جن اچھے خیالات کا اظہار کیا ہے وہ پہلے گذر چکے ہیں، علامہ سیوطی کی رائے تو یہ ہے کہ اس نہج پر اس سے اچھی کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی، علامہ شوکانی کا بیان ہے کہ تفسیر ابن کثیر اگر سب سے بہتر نہیں تو بہترین تفسیروں میں یقیناً ہے۔

یہ تفسیر دس جلدوں میں تھی[1]، اس کا قلمی نسخہ کتبخانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے[2]، اور سنہ ۱۳۰۰ھ میں نواب صدیق حسن خاں صاحب کی تفسیر فتح البیان کے حاشیہ پر بولاق مصر سے اور سنہ ۱۳۴۷ھ[4] میں تفسیر بغوی کے ساتھ[3] اور سنہ ۱۹۳۷ء میں مطبع مصطفےٰ محمد مصر نے اس کو نہایت اہتمام کے ساتھ

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۳۰۵ [2] تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۳ [3] معجم المطبوعات ج ۱ ص ۲۲۶

بڑی تقطیع کی چار بڑی جلدوں میں شائع کیا ہے، چاروں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۲۳۰۰ اور ۲۴۰۰ کے درمیان ہے، اس مضمون میں اسی نسخہ کے حوالے دیے جائیں گے۔

طریقۂ تفسیر سب سے پہلے اس تفسیر کے طرز اور اس کے اصولوں پر گفتگو کیجاتی ہے۔

حافظ ابن کثیر نے اس کے متعلق مقدمہ میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسکا خلاصہ حسب ذیل ہے،

۱۔ تفسیر القرآن بالقرآن: قرآن مجید کی تفسیر قرآن ہی سے کرنا سب سے عمدہ بہتر اور قابل اعتماد طریقہ ہے، کیونکہ جو بات ایک جگہ مجمل ہوتی ہے وہی اس کے اندر دوسری جگہ مفصل ہوتی ہے۔

۲۔ تفسیر القرآن بالسنۃ: اگر ایسا ممکن نہ ہو تو سنت نبوی کی جانب رجوع کرنا چاہئے، کیونکہ اس سے قرآن مجید کی شرح و تبیین اور تفصیل و توضیح ہوتی ہے، امام شافعیؒ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام احکام اور فیصلے قرآن ہی سے ماخوذ و مفہوم ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:-

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ
لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ
اللَّهُ وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا
(نساء -)

بیشک ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری تاکہ تو انصاف کرے، لوگوں کے درمیان جو کچھ سمجھا دے تجھ کو اللہ اور تو مت ہو دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا،

دوسری جگہ فرمایا:-

وَمَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ إِلَّا لِتُبَيِّنَ
لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيهِ وَهُدًى
وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ (نحل)

اور ہم نے اُتاری تجھ پر کتاب اسی واسطے کہ کھول کر سنا دے تو اُن کو وہ چیز کہ جس میں جھگڑ رہے ہیں، . . . .

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

الا انی اوتیت القرآن ومثلہ معہ — آگاہ! مجھے قرآن اور اس کے ساتھ اور چیز بھی دی گئی،

ظاہر ہے اس سے مراد سنت ہی، جو قرآن مجید کی طرح بذریعہ وحی نازل کی جاتی تھی، دونوں میں فرق صرف متلو اور غیر متلو کا ہے، امام شافعیؒ اور بعض دوسرے ائمہ نے اس کے متعدد دلائل بیان کئے ہیں، لیکن اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے، مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر خود اسی کے اندر تلاش کرنی چاہئے، اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو سنت نبوی کی جانب رجوع کرنا چاہئے،

حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے جو سوال کیا تھا، اور انھوں نے جو جواب دیا تھا، اور جس پر آپ نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا، اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے،

۳- تفسیر القرآن باقوال الصحابہ:- قرآن مجید اور سنت نبوی کے بعد صحابہ کے اقوال کی جانب رجوع کرنا چاہئے، کیونکہ وہ سب سے زیادہ قرآن کے متعلق واقفیت رکھتے تھے، اور انھوں نے ان قرائن و حالات کا مشاہدہ بھی کیا تھا جن میں قرآن مجید نازل ہوا تھا، اور ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ فہم سلیم، علم صحیح اور عمل صالح سے بھی بہرہ ور تھے، صحابہ میں بھی ائمہ اربعہ (خلفائے راشدین) اور ائمہ مہتدین یعنی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کو اس سلسلہ میں زیادہ خصوصیت حاصل ہے، اسی لئے مشہور مفسر اسماعیل بن عبد الرحمن السدی الکبیر کی تفسیر میں اکثر مرویات ان ہی دو بزرگوں یعنی حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی ہیں،

۴- تفسیر القرآن باقوال التابعین:- ان تینوں کے بعد مشکلات قرآن میں تابعینؒ

تبع تابعین کے اقوال سے رہنمائی حاصل کی جائے، ان لوگوں میں مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ، عطا بن ابی رباح، حسن بصری، مسروق بن اجدع، سعید بن مسیب، ابو العالیہ، ربیع بن انس، قتادہ اور ضحاک وغیرہ تابعین و تبع تابعین جو تفسیر قرآن کے مسلّم امام سمجھے جاتے ہیں، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں،

یہ چار مرکزی اور بنیادی اصول انھوں نے بتائے ہیں، جن کا انھوں نے اپنی تفسیر میں پورا التزام کیا ہے، وہ بظاہر قرآن سے آیتوں کا مفہوم بھی واضح کرتے ہیں، سنت و حدیث سے بھی پوری مدد لیتے ہیں، آیات کی تفسیر میں جو روایتیں معلوم ہوتی ہیں، ان سب کو نقل کرتے ہیں، اسی طرح صحابہ تابعین اور تبع تابعین کے اقوال پر بھی پوری نگاہ رکھتے اور ان کا استقصاء کرتے ہیں، اُن کی مثالیں اُن کی تفسیر میں اس کثرت سے ہیں کہ شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہیں، ایک جگہ ایک مفہوم کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں،

"یہ مفہوم زیادہ واضح اور ظاہر ہے، اس لئے کہ دوسری آیت میں بھی اس کا تذکرہ ہے، اور قرآن کے بعض حصے دوسرے حصوں کی تفسیر کرتے ہیں، اور یہی سب سے عمدہ طریقۂ تفسیر ہے، اس کے بعد صحیح حدیثوں کا اور اُن کے بعد آثار کا نمبر ہے"

(جلد ۳ ص ۲۲۶)

روایات و آثار کا تو انھوں نے اس قدر التزام کیا ہے، کہ اس کا شمار ان تفسیروں میں کیا جاتا ہے، جن کی بنیاد منقولات و روایات پر ہے، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:-

فسر بالاحادیث والآثار مسندۃ من اصحابها (ج ۱) — ابن کثیر نے مسند حدیثوں اور آثار کی روشنی میں تفسیر لکھی،

دوسرا ثبوت یہ ہے کہ اس تفسیر کا اصل ماخذ ابن جریر کی تفسیر کو بتایا جاتا ہے جس کا سارا

دارومدار روایات وآثار پر ہے، اس لئے اس کتاب کی بنیاد بھی آثار و روایات ہی پر ہے اور یہ اس کی سب سے اہم خصوصیت ہے،

اس نوع کی تفسیریں اور بھی لکھی گئی ہیں جن میں تفسیر ابن جریر اور در منثور نہایت مشہور ہیں لیکن سب میں احادیث کے انتخاب میں بے احتیاطی ہے، اور ہر طرح کی رطب و یابس یہاں تک کہ اسرائیلی روایات بھی ان میں شامل ہو گئی ہیں، مگر حافظ ابن کثیر ایک بلند پایہ محدث تھے، اس لئے انھوں نے محدثانہ طریق پر یہ کتاب مرتب کی ہے اور پوری احتیاط سے صحیح حدیثوں کے انتخاب کی کوشش کی ہے، غلط اور فاسد روایتوں پر سخت تنقیدیں کی ہیں، رواۃ پر جرح کی ہے، مختلف و متضاد روایتوں میں تطبیق اور ان کے مابین محاکمہ کیا ہے، روایتوں کے متعدد طرق و اسناد کا بھی ذکر کیا ہے، جس سے صحیح و غیر صحیح، جید و عدم جید اور رطب و یابس میں امتیاز کرنا آسان ہو جاتا ہے، اُن کی ان خصوصیات کی تفسیر کے ہر ہر ورق میں مثالیں ملتی ہیں، لیکن اُن کو نقل کرنا باعثِ طوالت ہے، ایک موقع پر لکھتے ہیں،

وقد ورد فی فضلها احادیث	اس کی فضیلت میں دوسری حدیثیں
آخر ترکناها اختصار العدم	بھی ہیں، جن کو ہم نے اختصار،
صحتها وضعف اسانیدها،	عدم صحت اور سندوں کی کمزوری
(ج ا ص ۳۰۸)	کی وجہ سے ترک کر دیا ہے،

عام مؤرخین اور اصحابِ سیر نے بھی اس خصوصیت کا ذکر کیا ہے، سیوطی کا خیال ہے کہ اس طرز کی اس سے عمدہ کوئی تفسیر ہی نہیں، حسینی کا بیان ہے کہ روایات کے نقطۂ نظر سے یہ سب سے مفید کتاب ہے، کیونکہ اس میں اسناد پر اکثر جرح و تعدیل کی گئی ہے، عام روایات نقل کرنے والے مفسرین کی طرح وہ مرسل روایتیں نہیں ذکر کرتے، کشف الظنون میں ہے،

کہ مسند احادیث و آثار کے ذریعہ تفسیر کی گئی ہے، اور جہاں جرح و تعدیل کی ضرورت پیش آتی ہے وہاں اس سے بھی کام لیا گیا ہے، صاحب البدر الطالع کا خیال ہے کہ اس میں مذاہب مسالک اور روایات و آثار کو نقل اور اُن پر عمدگی سے کلام کیا گیا ہے،

مگر حق یہ ہے کہ اُن کے توسع کی بنا پر یہ اعلیٰ اور بلند محدثانہ معیار خاطر خواہ قائم نہیں رہ سکا ہے تاہم اہلِ نظر کو اعتراف ہے کہ محدثانہ نقطۂ نظر سے یہ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد تفسیر ہے،

اسرائیلیات سے پرہیز منقولی تفسیروں کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ ان میں اسرائیلی خرافات کا بھی ایک کثیر حصہ شامل ہو گیا ہے، خود ابنِ کثیر کی تفسیر بھی ان سے خالی نہیں لیکن اصولی طور پر اسرائیلیات کے متعلق اُن کا نظریہ بڑا متوازن اور مناسب معلوم ہوتا ہے، اس کی وضاحت اُن کی تفسیر و تاریخ دونوں میں موجود ہے، ذیل میں تفسیر کے چند اقتباسات درج کئے جاتے ہیں،:-

"سدی بعض اوقات عبد اللہ بن مسعودؓ اور ابنِ عباسؓ سے اہلِ کتاب کے اقوال بھی نقل کرتے ہیں، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو مباح قرار دیا ہے،

بلّغوا عنی ولو اٰیۃ وحدّثوا	میری جانب سے روایت کرو خواہ
عن بنی اسرائیل ولا حرج و	وہ ایک ہی بات کیوں نہ ہو، اور
من کذب علیّ متعمداً فلیتبوأ	بنی اسرائیل سے بھی روایتیں کرو،
مقعدہ من النار،	اس میں کوئی مضائقہ نہیں، مگر یاد
(بخاری)	رکھو، جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ گھڑا

چنانچہ عبد اللہ ابن عمرؓ کو یرموک کے اہل کتاب کی کتابوں کے دو گٹھر ملے تو وہ ان سے روایتیں کرتے تھے، اس لئے کہ اس حدیث میں اس کی اجازت ہے، مگر اسرائیلی روایتیں تائید و تقویت کے بجائے صرف استشہاد کے لئے پیش کی جاسکتی ہیں، کیونکہ اُن کی تین قسمیں ہیں،

(۱) جن روایتوں کی صحت (صداقت کتاب اللہ سے معلوم ہوجائے) اور وہ اُس کے موافق ہوں، وہ یقیناً صحیح ہیں،

(۲) جن کا غلط اور جھوٹا ہونا صراحۃً معلوم ہو، اور وہ قرآن مجید کے خلاف ہوں،

(۳) جن روایتوں کا صدق و کذب کتاب الٰہی سے معلوم نہ ہوسکے تو اُن کو نہ تسلیم کیا جاسکتا ہے، اور نہ اُن کی تردید کی جاسکتی ہے، ایسی روایتوں کو نقل و بیان کرنا جائز ہے، مگر اس قسم کی اکثر روایتیں بے سود اور دینی اعتبار سے غیر مفید ہیں، اسی وجہ سے علمائے اہل کتاب کا اس طرح کی چیزوں میں شدید اختلاف ہوتا ہے، اور ہمارے علمائے تفسیر بھی مختلف الرائے ہوتے ہیں، جیسے اصحاب کہف کے نام، اُن کی تعداد، اُن کے کتے کا رنگ، یا عصائے موسوی کس درخت کا تھا، یا ان چڑیوں کے نام جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے اطمینان قلب کے لئے زندہ کردیا تھا، وغیرہ، ان سب کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مبہم رکھا، اور اُن کی تعیین سے کوئی دنیاوی یا دینی فائدہ بھی نہیں ہے، اس طرح کی باتوں میں ان کے اختلافات کو ذکر کرنا جائز ہے، اس لئے کہ خود اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے:-

سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ	اب بھی کہیں گے وہ تین ہیں، چوتھا
وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ	ان کا کتا، اور یہ بھی کہیں گے وہ پانچ
كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ	ہیں، چھٹا ان کا کتا، (یہ سب) بغیر
سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ قُلْ	نشانہ دیکھے پتھر چلاتا ہے، اور یہ بھی
رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَا يَعْلَمُهُمْ	کہیں گے وہ سات ہیں، اور آٹھواں
إِلَّا قَلِيلٌ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً	اُن کا کتا ہو تم کہہ دو میرا خدا ذخوب
ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ	جانتا ہے اُن کی گنتی، اُن کی خبر نہیں
مِّنْهُمْ أَحَدًا	رکھتے، مگر تھوڑے لوگ، سو اُن کی
(کہف ۳)	بات میں مت جھگڑا، مگر سرسری جھگڑا
	اور نہ ان لوگوں میں سے کسی سے اس
	بارے میں کچھ دریافت کر!

اس آیت میں اس طرح کے مواقع کے لئے رہنمائی ملتی ہے، کیونکہ اس میں تین اقوال نقل کئے گئے ہیں، پہلے دونوں کو اٹکل پچو کہا گیا ہے، اور تیسرے کے متعلق خاموشی اختیار کی گئی ہے، جو درحقیقت اس کی صحت کی دلیل ہے، کیونکہ اگر وہ بھی باطل ہوتا تو پہلے کی طرح اس کی بھی تردید کردی گئی ہوتی، تاہم اس کی تصریح کردی گئی ہے، کہ ان کی تعداد معلوم کرنا لاطائل اور بے سود ہے، .... اس طرح کے اختلافات میں مناسب طریقہ یہ ہے کہ جملہ اقوال نقل کرکے صحیح کی نشاندہی اور غلط کی تردید کردی جائے، اور اختلافات کے نتائج و فوائد بھی بیان کردیئے جائیں، تاکہ بے سود باتوں میں اختلاف و نزاع طویل نہ ہونے پائے، اور اہم باتوں سے بے توجہی نہ کی جائے، (ج ۱ ص۴)

سورۂ ق کی تفسیر میں اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ تحریر فرماتے ہیں:-

"بعض لوگوں نے "ق" سے کوہ قاف مراد لیا ہے، ان کا ماخذ اسرائیلی خرافات ہیں، کیونکہ ناقابل تصدیق و تکذیب امور کی روایت جائز ہے لیکن میرے خیال میں یہ اور اس طرح کی دوسری باتیں زنادقہ کی گھڑی ہوئی ہیں، جو لوگوں کا دین

مشتبہ کر دیتے تھے، اس امت میں بھی جلیل القدر علماء اور ماہرین فن محدثین کے ہونے کے باوجود اس طرح کی باتیں امتداد زمانہ کے سبب سے گڑھ لی گئی ہیں تو بنی اسرائیل میں کیوں نہیں گڑھی جا سکتی ہیں، ان کا زمانہ تو اور بھی قدیم ہے، ان میں حفاظ و ناقدین حدیث کی بھی کمی تھی، وہ فسق و فجور میں بھی ملوث تھے، اور ان کے علماء کلمات میں ہیر پھیر بھی کرتے تھے، شارعؑ نے

حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج

کہکر ان سے روایت کرنے کی اجازت ضرور دی ہے، مگر ان سے ان ہی باتوں کی روایت کی جا سکتی ہے، جن کو عقل باور کرتی ہو، اور جو عقلاً محال و ممتنع نہ ہوں لیکن جن کے باطل ہونے کا عقل صریح فیصلہ کر دے یا جن میں کذب و دروغ کا زیادہ امکان ہو، تو ان کی روایت کی اس میں کوئی گنجائش نہیں، متقدمین و متاخرین مفسرین قرآن اپنی تفسیروں میں بنی اسرائیل کے قصص و حکایات بیان کرتے ہیں، جن کی مطلق ضرورت نہیں" (ج ۴ ص ۲۲۱)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:-

"ہمارا مسلک یہ ہے کہ اس تفسیر میں اسرائیلی روایات سے احتراز کیا جائے، ان میں پڑنا ضیاع وقت ہے، اکثر روایتوں میں عام طور پر جھوٹ بھی ہوتا ہے، کیونکہ اس امت کے ائمہ فن اور نقادان حدیث کی طرح اہل کتاب نے صحیح و سقیم میں تفریق نہیں کی ہے۔" (ج ۳ ص ۱۸۲)

مگر اس واضح اور صحیح شعور کے باوجود ان کی تفسیر میں ایسی اسرائیلی روایات بھی شامل ہو گئی ہیں، جن کو فی الواقع خود ان کے اصول کے مطابق نہیں ہونا چاہئے تھا، مثلاً حضرت

ایوب کی بیوی کے تورات میں کئی نام ملتے ہیں، ان میں سے ایک نام رحمت بھی ہے، اور اس کو انھوں نے بلا تکلف (وَآتَيْنَاهُ أَهْلَهُ وَمِثْلَهُمْ مَعَهُمْ رَحْمَةً) کی تفسیر میں نقل کر دیا ہے[1]، اسی طرح وَاتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا کے متعلق بھی ابن جریر کے حوالہ سے ایک اسرائیلی روایت[2] ذکر کی ہے، جس کا مقصد زیب داستان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا،

قرآن مجید کی آیتوں میں باہمی مناسبت

قدیم علماء میں اکثر قرآن مجید کے ربط و نظم کے قائل تھے، امام رازی اس میں زیادہ نمایاں ہیں، لیکن حافظ ابن کثیر کا نظریہ بھی اس سلسلہ میں بہت واضح ہے، اور جا بجا اس کے نمونے ان کی تفسیر میں ملتے ہیں،

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا (بقرہ) کے متعلق لکھتے ہیں،

"اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی الوہیت ثابت کی تھی، اور اب اس کے بعد نبوت کا اثبات ہے،" (ج ۱ ص ۵۹)

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں،

"اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی ملائکہ کے مقابلہ میں شرف و عظمت اس طرح ظاہر کی ہے، کہ ان کو اور مخلوقات کے مقابلہ میں ہر چیز کے ناموں کی تعلیم دی تھی، گو یہ تعلیم دینا سجود ملائکہ کے بعد ہوا ہے، لیکن اس کو اس لئے پہلے ذکر کیا ہے کہ اس میں اور فرشتوں کی خلیفہ کو پیدا کئے جانے کی حکمت سے لاعلمی میں مناسبت تھی" (ج ۱ ص ۷۰)

لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَى قَوْمِهِ (اعراف) کا ماسبق و مابعد سے تعلق اس طرح ہے کہ

"ابتداء سورہ میں حضرت آدمؑ کا قصہ اور اس سے متعلقہ امور کا تذکرہ کیا گیا تھا، اس سے فارغ ہونے کے بعد عام پیغمبروں کا زمانی ترتیب کے لحاظ سے ذکر کیا جا رہا ہے، اور چونکہ حضرت

---

[1] تفسیر القرآن ج ۳ ص ۱۸۹ و ۱۹۰۔ [2] ایضاً ج ۱ ص ۵۵۹ و ۵۶۰

نوحؑ کا زمانہ سب سے قدیم ہے، اس لئے قدرتی طور پر سب سے پہلے اُن کا ہی تذکرہ موزوں تھا"

(ج ۲ ص ۲۲۳)

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ (رعد) کے متعلق فرماتے ہیں، :-

"چونکہ عالم علوی کا پہلے ذکر کیا گیا تھا، اس لئے اپنی قدرت وحکمت اور عالم سفلی کے احکام وقوانین کا تذکرہ بھی مناسب تھا،" (ج ۲ ص ۵۰۰)

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا (مریم) کی مناسبت اصل سورہ سے اس طرح بیان کی ہے :-

"اس سورہ میں حضرت عیسیٰؑ کی عبودیت اور اُن کے حضرت مریمؑ کے بطن سے بلا باپ کے پیدا ہونے کا ذکر گیا گیا تھا، اس لئے اب اُن لوگوں پر نکیر کی جا رہی ہے، جو کسی شخص کو خدائے رحمٰن کا بیٹا کہتے ہیں،" (ج ۳ ص ۱۳۸)

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں، :-

"چونکہ خدائے رحمٰن نے اپنے مومن بندوں کے پاکیزہ اوصاف اور عمدہ طور وطریق کا ذکر کیا تھا، اس لئے اس کی مناسبت سے اس آیت میں اُن کی جزاء کا ذکر کیا ہے"

(ج ۳ ص ۳۳۰)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (زمر) کی موزونیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں، :-

"یہاں یہ فقرہ نہایت موزوں اور فٹ ہے، کیونکہ اس سے پہلے مشرک اور مخلص مومن کی مثال بیان کی گئی تھی، جس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ تھا کہ مشرکین پر اتمام حجت ہو چکی ہے، اس لحاظ سے یہ فقرہ لانا نہایت موزوں اور مناسب تھا۔ (جلد ۴ ص ۳)

اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ (شوریٰ) کے متعلق لکھتے ہیں،

"چونکہ اوپر اللہ تعالیٰ نے قیامت کی ہولناکیوں، اور اس دن واقع ہونے والی بہت ساری چیزوں کا ذکر کیا تھا، اس مناسبت سے اب اس سے چوکنا رہنے، اور اُس دن کے لئے ابھی سے تیاری کرنے کا حکم دے رہا ہے" (ج ۴ ص ۱۳۰)

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ (حدید) کے بعد اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِي الْاَرْضَ کو لائے جانے کی حکمت اور مناسبت یہ ہے کہ :-

"جس طرح پانی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ خشک زمینوں کو سیراب کر دیتا ہے، اسی طرح ایمان وحی کے ذریعہ گناہوں کے اثر سے سخت ہو جانے والے دلوں میں گداز پیدا کر سکتا ہے، حیران اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو صحیح راستہ پر لگا سکتا ہے، اور اُن کے مصائب وآلام کو ختم کر سکتا ہے، کیونکہ جس طرح خشک مردہ اور بے آب وگیاہ زمینیں بارش سے لہلہا اٹھتی ہیں، اسی طرح قرآنی دلائل وبراہین سے سخت دلوں کو بھی ہدایت مل سکتی ہے، اور اُن کے بند کھول کر اُن میں روشنی پہنچائی جا سکتی ہے،"

(ج ا ص ۳ - وج ۴ ص ۳۱۱)

قرآن مجید کا ایک خاص اسلوب تقابل بھی ہے جو اُس کے منظم ومربوط ہونے کی بڑی دلیل ہے، حافظ ابن کثیرؒ نے ایسے مواقع پر عموماً نظم کلام اور آیتوں کی مناسبت بیان کر دی ہے، جس کی مثالیں بکثرت ہیں، اُن کے نزدیک قرآن کو مثانی بھی اسی لحاظ سے کہا گیا ہے، سورۂ بقرہ کی آیت وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے سلسلہ میں لکھتے ہیں،

"چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دشمنوں یعنی بدبخت کفار کے انجام کا تذکرہ کیا تھا، اس لئے اس کی مناسبت سے اب اس کے مقابلہ میں اپنے دوستوں یعنی خوش قسمت مومنین

کے اجر کا ذکر کر رہا ہے، اور مجموعوں کے مطابق قرآن کے مثانی ہونے کا یہی مطلب ہے کہ ایمان و ہدایت کے مطابق کفر و ضلالت اور سعادتمندوں کے ساتھ بدبختوں، یا اس کے برعکس یعنی کفر و ضلالت کے بعد ایمان و ہدایت اور بدبختوں کے بعد خوش نصیبوں کا تذکرہ کیا جائے، اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ کسی چیز کے ساتھ اس کے مقابل کا اگر ذکر کیا جائے، تو یہ مثانی کہلائے گا، اور اگر کسی چیز کے ساتھ اس کے امثال و نظائر کا تذکرہ کیا جائے تو یہ متشابہ ہوگا، (ج ۱ ص ۶۲)

سورۂ زمر کی آیت اللہ نزل احسن الحدیث کتاباً متشابھا مثانی کی تفسیر کرتے ہوئے اس خیال کی مزید وضاحت فرماتے ہیں:-

"بعض علماء کا خیال ہے اور سفیان بن عیینہ کی بھی یہی رائے ہے کہ متشابہ اور مثانی کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ نیز بیان کبھی ہم معنی ہوتے ہیں، تو ایسی دو چیزیں متشابہ کہلاتی ہیں، اور کبھی قرآن ایک بات کا تذکرہ کرتا ہے، تو اس کے ساتھ اس کے مقابل میں امر مخالف کا بھی ذکر کرتا ہے مثلاً مومنین اور کفار یا جنت و دوزخ یا اس طرح کی دیگر متضاد و مخالف چیزوں کا یکے بعد دیگرے تذکرہ کیا جائے، تو اس کو مثانی کہیں گے، اس کی مثالیں کلام مجید میں بکثرت ہیں، چند آیتیں ملاحظہ ہوں،

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ، یا کَلَّا اِنَّ کِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِیْ سِجِّیْنٍ اور پھر کہا کَلَّا اِنَّ کِتَابَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ یا مثلاً ھٰذَا ذِکْرٌ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ لَحُسْنَ مَآبٍ کے بعد ھٰذَا وَاِنَّ لِلطَّاغِیْنَ لَشَرَّ مَآبٍ تو اس قسم کے اسالیب تقابل مثانی کہلاتے ہیں، اور اگر وہ ایک ہی مفہوم کو ظاہر کریں، اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں تو ان کو متشابہ کہا جائے گا، لیکن یہ وہ متشابہ نہیں ہے جس کا

ذکر سورۂ آل عمران میں وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ کہکر کیا گیا ہے، (ج ۴ ص ۵۰)

قرآن مجید کی آیتوں میں مناسبت کا ذکر ابن کثیر نے اتنے مقامات پر کیا ہے کہ اگر ان کو اکٹھا کر دیا جائے، تو وہ ایک مستقل مضمون ہو سکتا ہے،

اصولی باتیں

حافظ ابن کثیرؒ کی تفسیر میں بعض اعلیٰ اصولی اور بنیادی باتیں ایسی ملتی ہیں جو دقیق و لطیف ہونے کے ساتھ ہی قرآن مجید کے طالب علموں کی رہنمائی کے نقطۂ نظر سے بڑی مفید ہیں، گو اس طرح کی باتوں سے اور تفسیریں بھی خالی نہیں، لیکن ان سے مصنف کی نکتہ رسی اور ذہانت و طباعی ظاہر ہوتی ہے، اس لئے ان کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، ان مثالوں میں بعض سے قرآن کے اسالیب پر بھی روشنی پڑتی ہے،

سورۂ انعام کی آیت وجعل اللیل سکناً والشمس والقمر حسباناً ذلک تقدیر العزیز العلیم کے متعلق لکھتے ہیں،

"اکثر اللہ تعالیٰ نے جب لیل و نہار اور شمس و قمر کے بنانے اور پیدا کرنے کا ذکر کیا ہے تو سلسلۂ کلام کا خاتمہ عزت و علم پر کیا ہے، جیسا کہ اس آیت میں بھی ہے، سورۂ یٰسین میں ہے وَاٰیَةٌ لَّھُمُ اللَّیْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّھَارَ فَاِذَا ھُمْ مُّظْلِمُوْنَ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّھَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ اور سورۂ حٰم السجدہ میں آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کے پیدا کرنے کے سلسلہ میں فرمایا: وَزَیَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَحِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (جلد ۲ ص ۱۵۹)

قرآن پاک میں سورۂ نحل کی آیت وعلی اللہ قصد السبیل کے سلسلہ میں رقمطراز ہیں:-

"جب اللہ تعالیٰ نے محسوس راستوں میں سواری کے کام آنے والے جانوروں کا

ذکر کیا تو غیر محسوس یعنی دینی اور معنوی راہوں کی بھی نشاندہی کر دی اور یہ قرآن مجید کا خاص اسلوب ہے کہ وہ محسوسات و مشاہدات سے غیر محسوس و غیر مرئی چیزوں کا یا بالفاظِ دیگر مادی امور سے روحانی، اور معنوی چیزوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اس کی مثالیں تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی اور یَا بَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ میں بھی موجود ہے۔" (ج ۲ ص ۵۶۳)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَکُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ (مومنون) کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"قرآن مجید میں انسانی خلقت کے ساتھ اکثر آسمانوں اور زمین کی تخلیق کا بھی ذکر کیا جاتا ہے، ایک جگہ فرمایا، لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَکْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ ۔ (ج ۳۔ ص ۲۴۲)

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"اکثر اللہ تعالیٰ نے توحید ربوبیت کے متعلق مشرکین کے اعترافات اور مسلمات بیان کرنے کے بعد اپنی الوہیت کا ذکر کیا ہے۔" (ج ۳ ص ۴۲۱)

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں :۔

"قرآن نے عموماً زمین کے خشک اور مردہ ہونے کے بعد بارش کی وجہ سے سرسبز شاداب ہو جانے سے معاد پر استدلال کیا ہے۔ سورۂ حج میں بھی اس قسم کا استدلال گذرا ہے" (ج ۳ ص ۵۴۰)

قرآن کے بعض اسالیب کا ذکر

اس کی مثال بھی دوسری تفسیروں میں ملے گی، اس میں بھی اس کی متعدد دلچسپ اور لطیف مثالوں کو نقل کیا جاتا ہے۔

"سورۂ ہود کی آیت وَاَخَذَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَۃُ کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

"یہاں صیحہ اعراف میں رجفہ اور سورۂ شعراء میں عذاب یوم الظلہ کا ذکر ہے حالانکہ یہ ایک ہی قوم کے عذاب کا تذکرہ ہے لیکن ہر مقام پر اس لفظ کو لایا گیا ہے جس کا موقع کلام متقاضی تھا، اعراف میں حضرت شعیبؑ کو قوم نے بستی سے نکالنے کی دھمکی دی تھی، اس لئے رجفہ کہنا مناسب تھا، یہاں چونکہ پیغمبر سے اُن کی بدتمیزی اور گستاخی کا ذکر تھا، اس لئے صیحہ کا لفظ لایا گیا ہے، اور شعراء میں انھوں نے بادل کا ٹکڑا آسمان سے اُتارنے کا مطالبہ کیا تھا، اس لئے وہاں فَاَخَذَھُمْ عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّۃِ کہا گیا، اور یہ سب اسرار دقیقہ ہیں۔" (ج ۲ ص ۴۵۰)

سورۂ زمر کی آیت لَوْ اَرَادَ اللّٰہُ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا (زمر) کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

"کبھی کبھی ایسی باتوں کو بھی مشروط کر دیا جاتا ہے، جن کا وقوع و جواز لازمی اور ضروری نہیں ہوتا، یہ ایسی ہی شرط ہے، اس کا مقصد مشرکین کی حماقت اور ان کے دعووں اور خیالات کی لغویت و جہالت ظاہر کرنا ہے، اس طرح کی مثالیں قرآن میں اور بھی ہیں، مثلاً لو اردنا ان نتخذ لھوًا لاتخذناہ من لدنا ان کنا فاعلین ایک اور جگہ ہے، قُلْ ان کان للرحمٰن ولد فانا اول العابدین، یہ سب از قسم شرط ہیں، اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شرط محال اور ممکن پر بھی لگائی جا سکتی ہے" (ج ۴ ص ۴۵)

سورۂ زخرف کی آیت (وانا الی ربنا لمنقلبون) کے سلسلہ میں لکھتے ہیں،

"یہ سیر دنیوی سے سیر اخروی کی طرف انتقال ہے جس طرح تزودوا میں زادِ دنیوی سے زادِ اخروی اور لباس تقوی میں لباس دنیاوی سے لباس آخرت و تقوی کی جانب انتقال ہے" (ج ۴ ص ۱۲۳)

سورۂ مومن میں غافر الذنب قابل التوب شدید العقاب کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"اس طرح کی آیت نبئ عبادی انا الغفور الرحیم وان عذابی ھو العذاب (حجر ۴۹) بھی ہے، قرآن میں اکثر مقامات پر ان دونوں وصفوں کو ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے، تاکہ بندہ امید و بیم اور خوف و رجا دونوں حالتوں پر قائم رہے۔" (ج ۴ ص ۷۰)

ووصینا الانسان بوالدیہ (احقاف) کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"اوپر توحید، اخلاص اور عبادت و استقامت وغیرہ کا ذکر تھا، اسی پر اس کو عطف کیا گیا ہے، اور یہ قرآن مجید کا خاص اسلوب ہے کہ وہ اطاعت خداوندی کے ساتھ اطاعت والدین کا بھی ذکر کرتا ہے، بنی اسرائیل میں ہے (وقضی ربک الا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احسانا) نیز سورہ لقمان میں فرمایا (ان اشکرلی ولوالدیک الی المصیر) جلد ۴ ص ۱۵۷)

غیر ضروری مسائل کی تحقیق و تدقیق کی مذمت

کتب تفسیر کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ ان میں غیر ضروری اور بے سود باتوں کی تحقیق بھی بڑے اہتمام سے کی جاتی ہے جو قرآن کے مقصد تذکیر و استدلال کے بالکل خلاف ہے، ابن کثیرؒ لکھتے ہیں،

"حضرت آدمؑ کو جنت میں جس درخت کے قریب جانے سے منع کیا تھا، اس کے متعلق چھ اقوال ہیں، ابن جریر کی رائے ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے کسی خاص اور متعین درخت کا پھل کھانے سے منع کیا ہوگا، لیکن ہم کو معلوم نہیں کہ یہ کونسا درخت تھا، کیونکہ قرآن مجید میں اللہ نے خود کوئی دلیل نہیں بیان کی ہے، اور نہ سنت نبوی سے اس کی کوئی تعیین ہوتی ہے، اس سلسلہ میں گیہوں، انگور اور تین وغیرہ کے نام لئے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی ہو سکتا ہے، لیکن اگر یہ متعین طور پر معلوم بھی ہو جائے تو اس علم سے کوئی خاص

فائدہ نہیں، اور اگر کوئی اس سے ناواقف رہتا ہے، تو اس کے لئے کچھ بھی مضر نہیں، امام رازیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں اس کو مبہم ہی رکھا ہے۔" (ج ۱ ص ۷۹، ۸۰)

فخذ اربعۃ من الطیر کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان چاروں چڑیوں کی تعیین میں مفسرین کا اختلاف ہے، حالانکہ ان کی تعیین بے سود اور غیر ضروری ہے، اگر یہ کوئی اہم بات ہوتی تو قرآن اس کی ضرور تصریح کر دیتا۔"

(ج ۱ ص ۳۱۵)

مگر اس تصور اور نظریہ کے باوجود وہ خود بھی بعض اوقات اس طرح کے غیر اہم اور غیر ضروری مباحث میں پڑ جاتے ہیں،

وسعتِ مطالعہ

تفسیر ابن کثیر کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ علامہ ابن کثیر کی نگاہ ان تمام ماخذ پر تھی جو اس وقت تک تحریر میں آچکے تھے، چنانچہ وہ تفسیر، علوم قرآن، حدیث، اصول حدیث، تاریخ، فقہ، اور کلام وغیرہ کی سیکڑوں کتابوں کے حوالے، اور بے شمار علماء کے اقوال و آراء کا اپنی تفسیر میں ذکر کرتے ہیں، مثلاً چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

متداول تفسیروں، ابن جریر، قرطبی، زمخشری اور رازی کے علاوہ واحدی، ابو مسلم اصفہانی، ابوبکر ابن منذر، وکیع بن جراح، ابن مردویہ، سنید بن داؤد اور عبد بن حمید وغیرہ، کتب حدیث میں صحاح ستہ کے علاوہ موطا امام مالک، مسند احمد، مستدرک حاکم، مسند بزار، معجم کبیر طبرانی، موضوعات ابن جوزی، شرح کبیر رافعی، مشکل الحدیث (طحاوی) استیعاب ابن عبد البر وغیرہ، اصول حدیث میں امام بخاری کی التاریخ الکبیر، ابن ابی حاتم کی کتاب الجرح و التعدیل وغیرہ، سیرت و تاریخ میں محمد بن اسحاق اور ابن ہشام کی سیرتیں، سہیلی کی الروض الانف، طبقات ابن سعد اور تاریخ ابن عساکر وغیرہ، فقہ میں امام الحرمین کی الارشاد، لغت میں صحاح

جوہری، اور ابن زیاد و فراء کی معانی القرآن، علوم قرآن میں ابو عبید قاسم کی فضائل القرآن اور کلام و عقائد میں بیہقی کی دلائل النبوۃ اور دوسری اہم کتابوں، ابن حبد لبر کی کتاب الاستذکار اور دمیاطی کی کشف الغطاء وغیرہ کے علاوہ بہت سی کتابوں کے حوالے ہیں، جن سے اُن کی وسعتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے،

(باقی)

اوتار اور عقیدۂ رسالت

از

مولانا ابو محمد امام الدین رام نگری

اس نام سے ایک مستقل کتاب بالاقساط ماہنامہ انوار الاسلام رام نگر میں شائع ہو رہی ہے، جس قدر اہم اور معرکہ آرا ہوگی، اس کا اندازہ کتاب کے موضوع سے کیا جا سکتا ہے، اردو میں اس موضوع پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے، جن لوگوں نے مصنف کی کتاب آواگون کا تفصیلی جائزہ اور دلائل القرآن الجواب دیانند سی افترا و بہتان دیکھی ہے، اُن کو اندازہ ہوگا کہ ہندو مذہب سے متعلق مصنف کا مطالعہ کتنا عمیق اور وسیع ہے، "اوتار" اور "عقیدۂ رسالت" ہندو مذہب کی اہم معلومات سے بھری ہوئی ہے، اس میں پہلے ہندو محققین و فضلا کی تحقیقات ہیں، اس کے بعد عقیدۂ اوتار کے دلائل پر تنقید کر کے عقیدۂ رسالت کی حقانیت ثابت کی گئی ہے،

چار روپیہ سالانہ منی آرڈر بھیج کر خریدار بن جائیے تاکہ اس کتاب کی تمام قسطیں آپ کے مطالعہ میں آجائیں۔

"منیجر"

ماہنامہ انوار الاسلام رام نگر، بنارس

علم کیمیا اور عرب

از جناب حکیم محمد نیاز صاحب پٹنہ

مصری حکما، لیپزگ یونیورسٹی (جرمنی) کے کتب خانہ اور یورپ کے بعض عجائب خانوں میں ایبرس پاپرس نامی جو مصری تحریریں موجود ہیں ان میں بعض ایسے معالجات مرقوم ہیں، جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ۳۰۰۰ سال قبل لکھی گئیں[1]۔

ان تحریروں سے پتہ چلا ہے کہ مصری علوم حکمیہ کا باوا آدم آتھوس بادشاہ تھا جس نے خالص فلسفہ اور علوم حکمیہ پر ۴۲ کتابیں تصنیف کیں، یہ چھ ہزار سال قبل مسیح گزرا ہے، اس لیے پرانے یونانی حکما، علوم حکمیہ میں قدیم مصری حکماء سے مستفید تھے[2]۔

یونانی حکما، قدیم ترین یونانی حکیم اسقلی بیوس کے انیسویں پشت میں حکیم بقراط جس کو یونانی حکما رب الطب کہتے ہیں، ۴۶۰ سال قبل مسیح پیدا ہوا، ارسطو صرف ۳۸۴ سال قبل مسیح اور اس کا شاگرد ثاوفرسطس ۳۷۰ قبل مسیح پیدا ہوئے، پھر اسپطرطوس اور اس کا ہمعصر ہیرافیلوس کا تو ذکر ہی کیا ہے؛ جو حضرت ۲۰۰ ق م کے حکما میں ہیں۔

ہندوستانی حکما، افغان کے بعد ہندوستان کی طرف آئیے تو یہاں مہاراج دھن ونتری ملتے ہیں، پھر ان کے مشہور شاگرد چرک نظر آتے ہیں، جو چرک سنگھتا کے مصنف ہیں، سر بھگونت جی مولف مختصر تاریخ ایورویدک کی تحقیق کے مطابق دھن ونتری جی مہاراج اور ان کے شاگرد حضرت مسیح علیہ السلام سے صدیوں

---

[1] وہنیس آف میڈیسن میکفی [2] تاریخ طب قدیم۔

پہلے گذرے ہیں، اس طرح مصر و یونان کی علوم حکمیہ کی ترقی کے درمیان جو بعد زمانی موجود ہے وہ یونان و ہند کے درمیان مفقود ہے۔

عرب حکماء جرجی زیدان نے اپنی کتاب "تاریخ التمدن الاسلامی" میں "کتاب الاغانی" کے حوالے سے لکھا ہے کہ عہد جاہلیت میں عرب "علاج بالعقاقیر والحشائش" یعنی جڑی بوٹیوں سے معالجہ میں مہارت رکھتے تھے، اور جناب نیر واسطی لاہوری نے علامہ براؤن کے لکچروں کے حاشیہ میں بتایا ہے کہ درحقیقت عربوں کا پہلا حکیم لقمان تھا، اور اس کے بعد خزیم، اسکے معنی یہ ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام سے صدیوں پیشتر عہد داؤدی میں وہاں بھی حکمت موجود تھی، قفطی اور ابن ابی اصیبعہ نے غالباً حارث بن کلدہ (ولادت ماقبل نبوت) کو عرب کا پہلا طبیب اس لیے بتایا ہے کہ اس نے سب سے پہلے جندی شاپور کے مدرسۃ الطبیہ میں طب کی تکمیل کی تھی، ورنہ عربوں کی حکمت کا سراغ یوں بھی ملتا ہے کہ رائج الوقت اصول حکمیہ میں سے بعض پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر تصدیق اور بعض پر تنقید حدیث کے ذخائر میں موجود ہے۔

اولیت اور قدامت کا فیصلہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو لقمان، ہرمس یا پرمس سے پہلے کا حکیم ہے، اس لیے اہل نظر خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ علوم حکمیہ میں مصر کی اولیت کا مسئلہ فیصلہ نظر ثانی کے قابل ہے یا نہیں؟

علم کیمیا آج بھی حکمت اور سائنس کی ایک شاخ ہے، حکمت کی ابتدا کہاں سے ہوئی، اور وہ کہاں کہاں پائی گئی؟ اس کا مختصر خاکہ سامنے رکھکر آسانی سے فیصلہ کرنا ممکن ہے کہ کس دور میں کس قدر خدمات حکمیہ کس ملک یا قوم نے انجام دیے، اس زمانہ میں جب تحریر کا رواج عام نہ تھا اور علوم و نظریات، فارمولے، ریکارڈ زیادہ تر سینہ بسینہ منتقل ہوتے تھے، خصوصاً کیمیا کے اسرار کے متعلق تو سبھی جانتے ہیں کہ اگلے لوگ ان کو ہر کس و ناکس کو بتانے کے بھی روادار نہیں تھے، چنانچہ جابر بن حیان مشہور کیمسٹ کا بیان ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے بار بار کیمیا کے سوالات کیے تو آپ نے چند معقول جواب دینے کے بعد فرمایا کہ اس سے زیادہ بتانے کا موقعہ و محل نہیں ہے (الطب العرب از نیر واسطی ص۳)

خود جابر بن حیان اس روش پر سختی سے کاربند تھا جس پر اس کی تحریریں آج بھی گواہ ہیں۔

عربی کیمیا کا جواب جس طرح عام علوم حکمیہ سے متعلق لوگوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ عربوں نے علوم تمامتر یونانیوں اور مصریوں سے حاصل کیے، اسی طرح یہ غلط فہمی بھی عام ہو کہ علم الکیمیا کو بھی انھوں نے سو فیصدی مصر اور یونان ہی سے حاصل کیا، لیکن حیرت ہے کہ جابر بن حیان کی زبانی حضرت علی کرم اللہ وجہہ والی روایت سبھی نقل کرتے ہیں، اس کے علاوہ فرانس کے معروف و ممتاز ڈاکٹر جوزف ہیرز کی مشہور کتاب "تاریخ الطب العربی" کے ذریعہ امام جعفر صادق سے سب آشنا ہو چکے ہیں، امام جعفر صادقؒ، جابر بن حیان کے رفیق و ہمعصر سہی، کیا کوئی محقق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق بھی یہی کہنے کی جرأت کر سکتا ہے؟

براؤن کے الفاظ یہ ہیں کہ "اموی شاہزادہ خالد بن یزید بن معاویہؓ علم کیمیا کا بہت دلدادہ تھا، اسی نے یونانی علوم کے لیے عربوں کے دل میں اول اول تحریک پیدا کی، کتاب الفہرست میں ہے کہ خالد بن یزید نے یونانی اور مصری حکماء کو مصر سے بلا کر جمع کیا، اور یونانی و مصری کتب کیمیا کو عربی زبان میں منتقل کرایا، اسلامی عہد کے اولین تراجم یہی تھے"۔

براؤن کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ عرب، یونانی و مصری علوم حکمیہ میں سے جس علم کی طرف سب سے پہلے متوجہ ہوئے وہ کیمیا ہے، خالد بن یزید بن معاویہؓ کی کیمیا سے دلچسپی بتاتی ہے کہ وہ قبل تراجم اس کا دلدادہ تھا، تو کیا صادقؒ کے ساتھ ساتھ خالد بن یزید کے یہ حالات باور نہیں کرا سکتے کہ جابر بن حیان سے پہلے عربوں میں کیمیا کا سراغ ملتا ہے؟

اگر جابر بن حیان سے پہلے عرب علم کیمیا سے آشنا تھے تو انھوں نے کیا ایجادات کیں؟ ان کی ابتدائی ترقیاں کیا تھیں؟ یہ بات البتہ محتاج تحقیق ہے، مگر جیسا کہ معلوم ہے، جاہلیت میں تحریر کا رواج کم تھا، اور اسلاف عرب کیمیا کو اسرار کا علم سمجھتے رہے ہیں اسی لیے انھوں نے اسے ہر کس و ناکس کو بتانے اور عام کرنے سے ہمیشہ احتراز کیا۔

جابر بن حیان | جابر بن حیان کو عرب کا سب سے پہلا کیمیا داں اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے کتابیں تصنیف کیں، اور متقدمین پر تنقیدیں کرکے ان کے اغلاط کی تصحیح کی، اس نے اپنے بعد واضح دلیل کے طور پر اپنی بہت سی باتیں چھوڑیں، جو آج بھی موجود ہیں، ورنہ جوزف ہیرز نے امام جعفر صادق کے عام تجربات وانکشافات کو بھی نہایت تحسین آمیز الفاظ میں بیان کیا ہے[1]،

جو لوگ اب تک منظر عام پر نہیں آئے، ان کا ذکر ہی کیا؟ خود جابر بن حیان کی شخصیت کو اہل یورپ نے جس طرح چھپانے یا مٹانے کی کوشش کی، وہ لائق افسوس ہے، براؤن جیسا شخص بھی اس سے نہ بچ سکا، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"قرون وسطیٰ میں اہل مغرب نے لاطینی زبان کی جو کتابیں جابر کے نام سے منسوب کی ہیں ان میں سے اکثر یورپین محققین کی تصنیفات ہیں، جنھوں نے اپنی کتابوں کو مقبول و مستند بنانے کے لیے انھیں جابر بن حیان کے نام سے منسوب کر دیا۔"

ایک براؤن ہی پر منحصر نہیں، جابر کے متعلق دوسرے یورپین مستشرقین بھی عجیب عجیب باتوں کا انکشاف کرتے رہتے ہیں، بعضوں کا خیال ہے کہ وہ ہارون الرشید کے عہد میں بغداد کا مشہور کیمیا داں تھا، بعض نے اس کی بہت سی تصانیف کو "تیرھویں صدی کے علماء کی لکھی ہوئی کتابیں" قرار دیا ہے۔ لاطینی زبان کی ایک تصنیف جس میں فلزات کے خواص اور کیمیاوی اعمال وصناحت سے بیان ہوئے ہیں، جابر سے منسوب ہے، لیکن اس کے متعلق بعض اہل یورپ کا خیال ہے کہ وہ ۱۳۰۰ء کی تصنیف ہے۔ جابر کی عربی تصانیف کے متعلق بھی کچھ دن ہوئے یہی رائے قائم کی گئی تھی کہ وہ جابر کے زمانہ کے بعد اسمٰعیلیہ فرقہ کے مذہبی پروپیگنڈہ کے تحت لکھی گئیں۔

اہل یورپ کی یہ روش اب ظاہر ہوتی جا رہی ہے کہ وہ مصر، یونان اور عرب و ہند کے عظیم حکماء،

[1] تاریخ الطب العربی ص ۷، از جوزف ہیرز، مطبوعہ مصر۔

کے خیالات اور تصانیف کے علاوہ ان کی تحقیقات، ایجادات اور انکشافات کو بھی اپنی طرف بڑی صفائی سے منسوب کر لینے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، ہاردے کو دورۂ دمویہ کا محقق بتا کر انھوں نے جالینوس کے ساتھ کتنی بے انصافی کی تھی؟ "احد عشر مقالۃ فی العین" کے مترجم پادری صاحب نے عین خانقاہ (Convent) میں بیٹھ کر اصل مصنف کے نام کو کس صفائی کے ساتھ تو گمنامی میں ڈالنے کی کوشش کی تھی[1]،

یہی سلوک بہتوں نے جابر کے ساتھ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن خود یورپ کے محققین براؤن کی اس رائے کو اب نہیں مانتے، یورپین مصنفین نے اپنی باوقعت تصانیف کو جابر کی طرف منسوب کرکے اپنی شخصیت کا خون کر لینا گوارا کر لیا، درحقیقت عربی کی بہت سی کتابوں کی طرح جابر کی کتابیں بھی لاطینی زبان میں منتقل کی گئیں جنھیں اکثر مغربی مصنفین غیر معروف شخصیت گیبر (Geber) کی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے باوجود اہل مغرب جابر بن حیان کی بیحد تعظیم کرتے ہیں، پروفیسر ایڈورڈ، جی، براؤن، موسیو گسٹاولی بان اور تمام مستشرقین و مورخین جابر کو علم کیمیا کی تاریخ کا ہیرو قرار دیتے ہیں، ہالائرڈ اور سارٹن کی رائے ہے کہ مشہور عرب کیمسٹ جابر ایک نہایت بلند پایہ کیمیا داں ہے، تمام منصف مزاج مغربی مورخین کو اعتراف ہے کہ جابر بن حیان نے علم کیمیا کو سائنٹفک طور پر مرتب کیا۔ جابر ہی نے کشتہ جات، تیزابات اور معدنی نمکیات بنائے، تصعید، ترشیح، تبخیر اور تقطیر وغیرہ کے طریقے ایجاد کیے، شراب سے الکوحل نکالنے کا طریقہ دریافت کیا، اور آرسنک اور انٹی مونی وغیرہ کو ان کے مرکبات سے علیحدہ کرنے کے اصول دریافت کیے، علم کیمیا پر جابر بن حیان کی سیکڑوں کتابیں بتائی جاتی ہیں، اس کی جو تصانیف دریافت ہو سکی ہیں وہ علم صنعت وکیمیا کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں، اور حکماء نے ہمیشہ ان کو نہایت احترام کی نگاہوں سے

[1] برہان از حکیم کبیر الدین۔

دیکھا ہے، موفق الدین بن ابی اصیبعہ کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن زکریا رازی کو جابر کی تصانیف اس قدر محبوب تھیں کہ اس نے ایک کتاب کو منظوم کر لیا تھا، چنانچہ ابن ابی اصیبعہ کے الفاظ ہیں

"ونقل کتاب الرحمۃ لجابر الی الشعر"

جابر نہ صرف عناصر کائنات کے تجزیہ میں فرد تھا، بلکہ وہ علم الٰہیات کا بھی بلند پایہ عارف تھا، وہ کائنات ارضی کے ساتھ ساتھ کائنات سماوی کے اسرار، اور کیمیائے ظاہری کے علاوہ کیمیائے باطنی کے معارف کو بھی بے حجاب کرتا تھا، اس لیے وہ کیمیا کے دوسرے علماء کے مقابلہ میں اور بھی لائق احترام ہے، جابر بن حیان جیسے بحر بیکراں سے کماحقہ استفادہ کے لیے مادہ و روح دونوں کی اہمیت سے واقف کار سائنسداں چاہئیں،

جابر کی تصانیف | مختب جابری، رسالۃ الاسقطس الاس کی جلدیں تفسیر کتاب الاسقطس، کتاب التجرید، کتاب الایضاح، کتاب الرحمۃ، کتاب الملک، کتاب النور، کتاب البیان، فوائد وغیرہ بڑی اونچی اور اہم نکات فن پر مشتمل ہیں، جن کا بیشتر حصہ آج بھی علمائے فن کی رسائی فہم سے بالاتر نظر آتا ہے، علم کیمیا میں "فوائد" جابر کی ایسی کتاب ہے جس میں زیادہ تر رموز نسخے درج ہیں، جن کو جلدکی نے اپنی کتاب "البدر المنیر فی ما یتعلق من الشمس والقمر من التدبیر" کے آخر میں درج کیا ہے، جابر کی بیشمار کتابوں میں سے بہت سی کتابیں بمبئی میں میرزا محمد ملک الکتاب کے اہتمام میں کب کی چھپ چکی تھیں، مگر حیرت ہے کہ براؤن کو باوجود ہر طرح کی سہولتوں کے اس کی صرف ایک ہی کتاب ملی، یعنی "برتھیلوٹ" کی مقبول عام کتاب "تاریخ کیمیا" میں جابر بن حیان کا ایک عربی رسالہ مل سکا جس کو متن وار فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ نقل کیا گیا ہے،

جابر کو عملی تقطیر اور عملی تبخیر کا موجد قرار دیا جاتا ہے، اور روح القلی، مرکیوبلس کلورائیڈ

حوامض تو یعنی تیزاب شورہ، تیزاب نمک اور تیزاب گندھک کی اولین تیاری بھی اسی کی جانب منسوب کی جاتی ہے، اس امر کا ثبوت کہ اجسام کا وزن جلنے کے بعد گھٹتا نہیں، بلکہ بڑھتا ہے، جابر ہی کی طرف منسوب ہے، ماء الملوک اور سونے کے حل کرنے کا کارنامہ بھی سب سے پہلے جابر ہی نے انجام دیا،

رازی | جیسا کہ اوپر بتایا گیا، رازی کو جابر بن حیان کی کتابیں اس درجہ عزیز تھیں کہ اس نے بعض کتابوں کو منظوم کر لیا تھا، مگر وہ محض جابر کا حافظ یا مقلد نہیں تھا، بلکہ فن کے اساتذہ میں تھا، وہ مؤلف ہی نہیں، بلکہ مصنف بھی تھا، براؤن لکھتے ہیں :۔

"جب ہم رازی کی فہرستِ تصانیف کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ہم کو صحیح معلوم ہوتی ہے اور اس میں شک و شبہہ کی گنجائش نظر نہیں آتی، اس فہرست کا تین قابل اعتماد سوانح نگاروں نے ذکر کیا ہے (تین سوانح نگاروں سے مراد غالباً ابن ابی اصیبعہ، ابن القفطی اور ابن الندیم ہیں (م ن)) اور خود رازی کے حوالوں اور بیانوں سے اس کی تصدیق ہوتی ہے، رازی کی ۱۱۳ بڑی اور ۲۸ چھوٹی کتابوں اور دو نظموں کا ذکر ہے۔"

واضح رہے کہ یہ دو نظمیں علم الکیمیا کے مسائل پر مشتمل ہیں، رازی ایرانی النسل تھا، اور اسکی جائے پیدائش رے ہے، براؤن اور ڈاکٹر ڈانلڈ کیمبل مؤلفین عربین میڈیسن اور برٹش انسائیکلوپیڈیا نے رازی کے متعلق بھی خاصی غلط نگاری اور تعصب سے کام لیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ رازی طب اور حکمت کے ماہرین خصوصی میں تھا، اگرچہ قفطی اور ابن ابی اصیبعہ نے علم کیمیا پر اسکے صرف بارہ ہی رسائل کا ذکر کیا ہے، لیکن البیرونی نے اس کی ۲۱ تصانیف لکھی ہیں، جن میں سے چند کے نام حسب ذیل ہیں :۔ صنعت الکیمیا، کتاب الاحجار، کتاب الاسرار، کتاب الحجر الاصغر، کتاب التدبیر اور کتاب الرد علی الکندی فی قولہ با متناع الکیمیا۔

علم الکیمیا میں رازی دو حیثیتوں سے ممتاز ہے، اول یہ کہ اس نے مادوں کی تقسیم کی،

دوم اس نے کیمیاوی اعمال کو نہایت وضاحت سے بیان کیا اور اس میں کسی پراسرار عنصر کی آمیزش کا قطعی ذکر نہیں کیا، رازی سے پہلے ماہرین علم کیمیا، ان کو اجسام، ارواح اور جواہر میں تقسیم کرتے تھے، لیکن رازی کیمیاوی مادوں کو جمادات، نباتات اور حیوانات میں تقسیم کرتا ہے، رازی وزن مخصوص پر تجربات کیا کرتا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ جس آلہ کو کام میں لاتا تھا، اس کا نام اس نے المیزان الطبیعی رکھا تھا (مقالۃ فی الحصی والکلی والمثانہ مجلہ "طب الجراحت ص ۴" لاہور بابت جون ۱۹۵۰ء) وزن مخصوص سے وہ عدد مراد ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ کوئی شے پانی سے کتنا زیادہ یا کم وزن رکھتی ہے؟

ملک الکتاب آقائے مرزا محمد نے بمبئی سے رازی کی فارسی میں ایک تصنیف ۱۳۱۴ھ میں شائع کی ہے، اس کتاب کا نام "سر مکنون من تصنیف زکریا رازی" ہے، یہ کتاب غالباً رازی کی کسی عربی کتاب کا فارسی ترجمہ ہے، جس میں اس نے علم کیمیا پر سیر حاصل بحث کی ہے، اعمال فن میں تصعید، تشمیع، تکلیس اور تحلیق وغیرہ پر نہایت تفصیل سے گفتگو کی ہے،

رازی کے انکشافات میں سے فاسفورک ایسڈ اور کیلشیم آج تک جس درجہ اہمیت رکھتے ہیں وہ حاملین فن سے پوشیدہ نہیں،

دوسرے ماہرین فن

ماہرین طب وحکمت میں بوعلی سینا، ابن بیطار اور قرشی وغیرہ کا بھی علم کیمیا سے ضروری حد تک تعلق تھا،

خاص کیمسٹری میں جلد کی کی مفید کتابیں اور جبر مانی کی کتاب الکیمیا خاص توجہ کی مستحق ہیں، علم السموم اور علم التریاقات میں سینا اور رازی کے علاوہ تمیمی النحوی کی جوامع کتاب التریاقات کے ذریعہ علم کیمیا کی ترقی میں جو آسانیاں فراہم ہوئیں، ان سے اہل فن واقف ہیں، ابوالعلاء ابن زہر ابومروان بن ابی العلاء، اور حفید جیسے علماء کے علاوہ ابو عثمان العزاز، محمد بن سعید، عبدالرحمن

ابن اسحٰق بن ہیثم اور ابو عبداللہ الصقلی، ابن جلجل نے مفردات پر بڑا کام کیا ہے۔

کیمیائے جدید اور دنیا عرب

علم کیمیا پر آج بھی عرب علماء کی تحقیقات و تصانیف کا سلسلہ جاری ہے، ڈاکٹر نقولا باتیلور نے کتاب الکیمیا والابتدائیہ کے نام سے ایک بیش قیمت کتاب لکھی ہے، ڈاکٹر حسن یوسف نے کتاب الاسرار الکیمیائیہ والفوائد الصناعیہ تالیف کی ہے، پھر اصول الکیمیا کے نام سے ایک قابل قدر کتاب فانڈیک نے لکھی ہے، جو بیروت میں طبع ہوئی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نئے عرب میں سائنس اور کیمیا پر تحقیقات کا شوق بڑھ رہا ہے،

مسٹر گمسٹن کی رائے

سطور بالا سے عربوں کی خدمات کا پتہ چلتا ہے، لیکن یورپین پھر بھی الزام دیتے ہیں کہ عربوں نے صرف یونانی علوم وفنون کو عربی زبان میں منتقل کر کے ان کی حفاظت کی ہے، ان کی ترقی وتجدید واختراع میں ان کا بہت کم حصہ ہے، ان کی اس رائے کی تردید میں مناسب ہوگا کہ جنیوا یونیورسٹی کے مستند ومعتبر پروفیسر تاریخ وفلسفۂ طب مسٹر گمسٹن کی رائے نقل کر دی جائے، وہ لکھتے ہیں:

"بہت عرصہ تک یہ امر صحیح سمجھا جاتا رہا کہ عرب غلامانہ طور پر یونانیوں کے نقال تھے اور وہ علم کی ترقی میں حائل ہوئے، لیکن یہ خیال غلط ہے، کیونکہ عرب میں جس وقت مشرق میں ظاہر ہوئے، یونانی حکمت بالکل مٹ چکی تھی، اور چاروں طرف جادوگری کے طریقے اور عملیات رائج تھے، اس وقت عربوں نے نہ صرف یونانی علوم کے خزانے کو ہمیشہ کے لیے تباہی سے بچا لیا، بلکہ انھوں نے یہ بھی کیا کہ یونانی تصانیف کو ہر دلعزیز بنا کر اور ان پر نقد وتبصرہ کر کے مشرق اور مغرب میں سائنس کی تعلیم کا عام مذاق پیدا کر دیا، پس عرب علماء وحکماء اگر صرف یونانی علوم کی کتابوں کو جمع کرنے اور ان کو یورپ میں منتقل کرنے ہی پر اکتفا کرتے تو بھی صرف یہی کام ان کے لیے کچھ کم باعث فخر نہ تھا، لیکن انھوں نے اس سے بڑھ کر یہ کیا کہ ادویات اور سائنس دونوں میں تازہ اور نئی نئی تصانیف مرتب کیں۔"

واقعہ یہ ہے کہ لقمان کی قوم علم کیمیا کی بلند و بالا عمارت کی وہ پہلی اینٹ ہے جس پر اس کی پوری عمارت قائم ہے، جس کی دیواروں پر چڑھ کر آج کا انسان چاند سے باتیں کر رہا ہے، خود ماسکو ریڈیو نے اعلان کیا تھا کہ ہم نے مصنوعی چاند کا فارمولا عربوں سے حاصل کیا ہے، اور المقنع (ابن بیطار) کا مصنوعی چاند دنیا کا سب سے پہلا مصنوعی چاند تھا، جو خلافت عباسیہ کے تیسرے خلیفہ مہدی بن منصور کے عہد میں مطلع سائنس پر طلوع ہوا، اس چاند کا موجد المقنع علاقہ مرو کا باشندہ تھا، اور اس کے چاند کا ذکر تاریخ میں "ماہ نخشب" کے نام ہوتا ہے، غالب کا شعر ہے ؎

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

جمع و تدوین قرآن

یوپی کے مشہور آئی سی، ایس افسر جناب سید صدیق حسن صاحب مرحوم کا جمع و تدوین قرآن کے عنوان سے جو مضمون معارف میں کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا اور جس کو اہل نظر نے بیحد پسند کیا تھا، اس کو معارف پریس نے ان کی یادگار میں الگ کتابی صورت میں بھی شائع کر دیا ہے، اس میں فاضل مصنف نے قرآن کی جمع و تدوین کی تاریخ پر بڑی محققانہ بحث کی ہے، اور بہت پرزور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید عہد نبوی ہی میں مدون اور مکمل ہو گیا تھا، یہ رسالہ علماء و محققین خصوصاً قرآن کے طلبہ کے لیے بیحد مفید ہے، ایک آئی سی، ایس کے قلم سے، جس کی ساری عمر انتظامی اور عدالتی کاموں کی انجام دہی میں گزری ہو، ایسے اہم اور تاریخی مسئلہ پر اتنا محققانہ اور فاضلانہ مضمون بہت سبق آموز اور قابل قدر ہے۔

قیمت: ۔/عا

منیجر

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی

کی

ایک نایاب تصنیف

از

جناب محمد عضد الدین خان صاحب ایم اے، ادارۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور اُن کے خاندان کی علمی و عملی خدمات سے آج کا علمی طبقہ بخوبی واقف ہے، ایک فاضل مصنف نے بالکل صحیح لکھا ہے، کہ ۱۸۵۷ء اور اس سے پہلے کی علمی دنیا کا ذکر کرنا شاہ ولی اللہ اور اُن کے خاندان کا ذکر کرنا ہے، اس خاندان عالی مرتبت کے افراد نے ہندوستان میں اسلام کی وہی خدمات انجام دیں جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اپنے دور میں انجام دی تھیں، اور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں اسلام جیسا بھی اور جو کچھ بھی باقی ہے وہ اسی خاندان کا طفیل ہے،

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی اس خاندان کے وہ بزرگ ہیں، جنھوں نے اپنے والد ماجد کے نقش قدم پر چل کر ہندوستان میں علوم اسلامیہ کو عام کیا، اور مسلسل ساٹھ سال تک مسلمانوں کی علمی و دینی خدمت کرتے رہے، اُن کی شخصیت بڑی جامع تھی، اپنے زمانے میں ہر فن میں یکتا اور کامل سمجھے جاتے تھے، وہ اپنے دور میں تنہا شخص تھے، جن کے ذریعہ

علوم دینیہ بالخصوص علم حدیث کی روایۃً ودرایۃً اشاعت ہوئی، اور آج ہندوستان کا شاید ہی کوئی عالم حدیث ایسا ہو جس کا سلسلۂ تلمذ شاہ عبدالعزیز تک نہ پہنچتا ہو، تفسیر میں اس زمانہ کے بڑے بڑے علماء اُن کے شاگرد رہے، اُن کی تفسیر قرآن مجید اپنی مثال آپ ہے، فقہ میں اُن کی دقتِ نظر کا اندازہ اس سے ہوتا ہے، کہ انھوں نے سب سے پہلے ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا، مگر اسی کے ساتھ ہر مسلمان کے لئے انگریزی تعلیم جائز قرار دی، سلوک و تصوف کے میدان میں اُن کا سب سے اہم کارنامہ حضرت سید احمد شہید جیسے امام کی تعلیم و تربیت ہے، درس و تدریس، تعلیم و تعلم میں اُن کے کمال کا اندازہ مولانا اسماعیل شہید، شاہ محمد اسحاق اور سلامت اللہ کشفی جیسے علماء کی تعلیم و تربیت سے ہوتا ہے، اُن کی تصنیفات میں تحفہ اور فتاوی اُن کی بالغ نظری کا بین ثبوت ہیں، دوسرے علمی میدانوں میں بھی اس جامعیت کی دوسری نظیر اُن کے بعد مشکل ہی سے نظر آئے گی، اُن کو معقول و منقول دونوں میں یکساں مہارت تھی، معقولات میں بھی بڑے بڑے معقولی اُن کے خوشہ چین نظر آتے ہیں، شاہ صاحب حدیث، تفسیر، فقہ، تصوف، عقائد، فلسفہ، منطق میں تو یکتائے دہر تھے ہی مگر بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ فن موسیقی کے بھی بڑے ماہر تھے،

تذکروں میں اکثر آتا ہو کہ شاہ عبدالعزیز صاحب فن موسیقی سے اچھی طرح واقف تھے، مولانا عبدالحئی صاحب مرحوم ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء نزھۃ الخواطر میں شاہ صاحب کے حالات میں لکھتے ہیں :-

وکانت لہ مہارۃ فی الرمی	آپ کو تیر اندازی شہسواری اور
والفروسیۃ والموسیقی[۵۰]	موسیقی میں کمال حاصل تھا،

[۵۰] نزہتہ الخواطر جلد ۷ ص ۲۷۹،

دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی کچھ اسلاف کی روایت سے اور کچھ ملفوظات شاہ عبدالعزیز کی روشنی میں اُن کی موسیقی دانی کا تذکرہ کیا ہے، اس لئے اب تک اس کے ذرائع صرف یہی دو تھے، ملفوظات کے متعدد مقامات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے، کہ شاہ صاحب موسیقی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے، چنانچہ ایک جگہ مذکور ہے،

"ایک قوال اپنے نومولود بچے کا نام رکھانے کے لئے حاضر ہوا، حضرت نے سلام یا سلامت اللہ نام تجویز فرمایا، پھر اس قوال سے ارشاد فرمایا کہ کچھ دھناسری میں سناؤ، چنانچہ مدرسہ شریف میں قوال نے گا کر سنایا، پھر کوئی دوسری چیز شروع کی، فرمایا پھر وہی گاؤ، کافی دیر اُس کو گانے کے بعد قوال نے پھر کوئی اور چیز شروع کی، فرمایا وہی خوب تھی .... تھوڑی دیر کے بعد ایک مرید کی طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ پہلے میرے سر میں جو درد ہو رہا تھا، گانا سننے سے جاتا رہا، اور سر میں جو کپڑا درد کی وجہ سے بندھا ہوا تھا، اس کی گرہ کھول لی"[۵۱]

ایک اور جگہ ذکر ہے :-

"ایک شخص اپنی اصطلاح کے مطابق مستی کی حالت میں کچھ گا رہا تھا، آپ نے سُنا تو فرمایا کہ دھناسری ہے یا رنجن یا ملتانی، اور گانے کی دوسری قسموں کو بیان کرنے کے بعد پھر فرمایا، کہ پہلے مجھے اس فن سے دلچسپی تھی، اور اس فن کے مشہور لوگ میرے پاس پوچھنے آتے تھے، اب میں نے اس میں حصہ لینا ترک کر دیا ہے، لیکن لوگ اب بھی آجاتے ہیں، اگر مجھے اس سے ضرر

[۵۱] ملفوظات ص ۱۳۳،

پہونچتا ہے، کیونکہ قلب میں ایک ہیجان کی سی کیفیت ہوتی ہے، اور اس کی وجہ سے مرض لاحق ہوتا ہے۔[1]

ملفوظات کی مندرجۂ بالا عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ صاحب فنِ موسیقی سے دلچسپی رکھتے تھے، اور اپنے زمانے میں اس فن میں بھی مرجع خلائق تھے، مگر اب تک یہ باتیں زیادہ تر زبانی روایت اور قیاس پر مبنی تھیں، اور اس سلسلہ میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی تھی، اور نہ اس فن میں اُن کے کمال کا صحیح اندازہ ہی لگایا جا سکتا تھا، اب تک صرف یہ کہا جا سکتا تھا کہ شاہ صاحب موسیقی کے بارے میں بھی کچھ جانتے تھے، مگر اس کی تفصیل نہیں ملتی تھی، خوش قسمتی سے راقم الحروف کو اس فن میں خود شاہ صاحب کا تصنیف کردہ ایک ساز "سانگیت شاستر" کے نام سے رامپور کے ذخیرۂ مخطوطات میں مل گیا، جس سے اب یہ بات پورے دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے، کہ شاہ صاحب موسیقی کے بھی استاد کامل تھے، اور اس زمانہ کے مشہور اصحابِ فن اس میں بھی اُن کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرتے تھے،

یہ رسالہ رضا لائبریری رامپور کی فہرستِ فارسی مخطوطات میں نمبر ۱۸۶۹ کے تحت درج ہے، اور سو صفحات پر مشتمل ہے، پہلے صفحے کے علاوہ ہر صفحے میں انیس یا بیس سطریں ہیں، رسالہ کی زبان فارسی ہے، اس کا خلاصہ اردو میں پیش ہے،

رسالہ میں تین ابواب ہیں، پہلا باب "در ذکر تعداد سرہا و لواحق آن و آں چہار فصل است"۔

فصل اوّل :- "دربیان حقائق و اسامی سرہا" میں لکھتے ہیں :- ماہرین فن نے اصول

---

[1] ملفوظات ص ۱۶۴،

اصوات کو سات سروں میں تقسیم کیا ہے، حیوانات کی زبان سے یا نباتات وجمادات کے ٹکراؤ سے جو بھی آواز پیدا ہوتی ہے، اُن کو ایک خاص نام سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کے بعد ساتوں سُروں کے نام، ان کے فروع، مصادر اور ہندوستانی سنگیت کا مختصر ذکر کیا ہے، اس کے بعد ساتوں سُروں کے "لون، صورت، مخارج، اقالیم، موکل، ایام، اوقات شبان روز، مناسب آواز جانوران، وغیرہ کا ایک جدول تحریر کیا ہے،

فصل دوم :- "در گرامہا بدانکہ گرام عبارتست از قرارگاہ سرہاے مذکورہ و آں ہر یک سرہا را سہ موضع بود کہ ہر یک مضاعف آن دیگر باشد" اس کے بعد مختصر مگر جامع طور پر ایک سُر کو دوسرے سے ملانے سے جو نیا سُر پیدا ہوتا ہے، اس کی تفصیل بتلائی ہے،

فصل سوم :- "دربیان سرت باید دانست کہ سرت عبارتست از مسل سرہاے مذکورہ مراکز اعتدال خود" اس فصل میں بائیس سُر بیان کئے ہیں، اور ایک جدول بھی دیا ہے،

فصل چہارم :- "درحقیقت مورچھنا، پردوں کے صعود و ہبوط سے سات سروں میں سے ہر ایک میں تین قسمیں نکلتی ہیں، جن کی ترکیبیں جداگانہ ہوتی ہیں،

بعض کے نزدیک یہ کل ملا کر چونسٹھ اقسام ہوتی ہیں، مصنف نے اکیس اقسام کا جدول بنایا ہے :-

باب دوم :- "در معرفتِ راگ کہ آن پنج فصل است"

فصل اوّل :- "در ماہیت راگھا .... سروں کے خواص مختلف ہیں، چوب وسنگ وغیرہ کے اختلاف سے سات سروں کی بے شمار صورتیں ہو جاتی ہیں، اس فن کے فضلا نے ایک سو چھیاسٹھ صورتوں کو منتخب کیا ہے، اور اُن کے اسمار بھی مقرر کئے ہیں :-

فصل دوم :- "دربیان ترکیب وتقسیم اقسام راگھا" راگوں کی ابتدا میں تین قسمیں بتلائی ہیں :-

پھر ان قسموں سے پیدا شدہ اقسام بیان کئے ہیں

فصل سوم :- میں مصنف نے چھ راگوں کو سرخیل قرار دیا ہے، اور جدول میں اُن سے پیدا شدہ اڑتالیس اقسام درج کئے ہیں، چھ سرخیل راگوں کو سات سُروں سے ترکیب دینے پر یہ مختلف اقسام پیدا ہوتے ہیں مصنف نے اُن کے نام بھی درج کئے ہیں،

فصل چہارم :- "دربیان و تفصیل راگہا و اوقات و امتزاجات"۔ ہر راگ کے توابع اور لواحق ہوتے ہیں، چھ راگوں سے چھ راگنیاں نکلتی ہیں، ہر راگ کے ساتھ خدمت گار ہیں، ہر راگنی کے چھ فرزند، اور ایک خدمت گار، چھ راگوں میں سے ہر ایک کی ۱۲۶ قسمیں مع نام ماہرین فن نے بیان کی ہیں، مصنف نے جدول بھیروں کے تحت پنچانوے ۹۵ قسمیں جدول مالکوس میں اسمائے کے ساتھ اٹھاسی قسمیں جدول ہنڈول کے ناموں کے ساتھ چوراسی قسمیں جدول دیپک میں چوارسی قسمیں جدول میگھ کی چھیاسٹھ ۶۶ قسمیں جدول سری راگ ناموں کے ساتھ اُناسی ۷۹ قسمیں تحریر کی ہیں،

فصل پنجم :- "دربیان صورت راگہا" اس فن کے ماہرین نے عالم تصور میں ہر ایک راگ اور راگنی کو ایک خاص صورت اور مخصوص معنی کے ساتھ موسوم کیا ہے، مثلاً ایک کو بادشاہ راگ دوسرے کو شکل مرتاض وغیرہ مختلف صور و اوضاع کے ساتھ معنون کیا ہے۔ پھر وضع صور اور اوقات کے اعتبار سے راگوں کی قسمیں کی گئی ہیں،

باب سوم :- درحقیقت تال و آن دو فصل است، فصل اول در تال کہ بفارسی اصول گویند عبارتست از ضبط زمان امتداد حرکات و سکنات اصوات" دو ہاتھوں یا دو چیزوں کے نیچے ہو پھر ان کو ایک دوسرے پر مارتے ہیں، "اوقات کے فاصلہ کی برابری اور ضرب کی مقدار وغیرہ کا ذکر ہے۔ ان کی چار قسمیں ہیں، پھر ہر ایک قسم کی بے شمار قسمیں ہیں، ان میں سے مصنف نے مستعمل و متعارف اقسام کو بیان کیا ہے :-

فصل دوم :- دربیان اقسام ساز جو تاروں ڈھولک دف اور نقارہ وغیرہ کے باعث پیدا ہوں، بانسری اور چوب وغیرہ کے ذریعہ ساز پیدا کرنا، ان سب کے ضوابط میں مصنف نے اس مختصر رسالے میں ان کا صرف حوالہ دیا ہے تفصیل نہیں بتلائی ہے،

رسالہ کے آخر کی یہ دو سطریں بڑی اہم ہیں،

"وایں رسالہ خلاصہ .... رسالہ جات مذاہب مختلفہ ترتیب کشید

واللہ اعلم بالصواب، تمام شد رسالہ سانگیت شاستر تصنیف، استاذی حضرت شاہ

عبدالعزیز صاحب دہلوی طاب ثراہ بخط کندن لال اشکی"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ رسالہ کندن لال اشکی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اور وہ اپنے کو شاہ صاحب کا شاگرد لکھتے ہیں، کندن لال اشکی کوئی غیر معروف شخصیت نہیں، بلکہ اپنے دور کے نامور باکمال تھے، جن کا تذکرہ بہت سے تذکروں اور تاریخوں میں ہے[۱]

---

[۱] معارف : مغلوں کے آخری دور میں ہندوؤں میں جو باکمال شخصیتیں پیدا ہوئیں، ان میں ایک راجہ کندن لال اشکی بھی تھے، اُن کا گھرانا پشتہا پشت سے علمی اور دنیاوی وجاہت میں ممتاز چلا آتا تھا، اُن کے اجداد مغلوں کے زمانہ میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہے، اُن کے والد منولال فلسفی شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی اور شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی کے شاگرد اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے، دہلی، اودھ، اور انگریزی سرکاروں میں مختلف عہدوں پر مامور رہے، راجہ کندن لال اشکی ان ہی کے فرزند رشید تھے، انھوں نے علم و فضل میں اپنے والد سے بھی زیادہ ناموری حاصل کی بعض تاریخوں اور تذکروں میں اُن کے حالات ملتے ہیں، نواب صدیق حسن خان تذکرہ روز روشن میں لکھتے ہیں، :-

" راجہ کندن لال اشکی مولدش شہر بریلی بود در سرکار شاہ اودھ بعہدہ

اس رسالہ کی زبان بھی ایسی ہے کہ شاہ صاحب کی تحریروں اور تراکیب سے ادنیٰ سی مناسبت رکھنے والا شخص بھی بلا تامل کہدے گا کہ یہ عبارت شاہ عبدالعزیز کے قلم کے علاوہ اور کسی کے قلم سے ممکن نہیں، رسالے کے داخلی اور خارجی شواہد پر غور کرنے کے بعد یہ بات پوری طرح متحقق ہو جاتی ہے، کہ یہ رسالہ شاہ عبدالعزیز صاحب ہی کی تصنیف ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے اکثر تلامذہ نے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا؟ اگر ہم غور کریں تو اس کا جواب مشکل نہیں ہے، ملفوظات کی جو عبارتیں ہم نے اوپر نقل کی ہیں، اُن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے یہ فن اوائل عمر میں سیکھا تھا، اور جوں جوں

(بقیہ حاشیہ ص ۴۶۳)

منشی الملو کی سرفرازی داشت و مدت العمر در شہر لکھنو بسر نمود، علوم حکمیہ را بخدمت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب استفادہ نمود، دفنون معقولاتش متحضر بودہ، مدت سی سال کما بیش گذشتہ، کہ ازیں جہان بگذشت (تذکرہ روز روشن)

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی نے کندن لال اشکی پر ایک مستقل مضمون لکھا تھا، جو ان کے مجموعۂ مقالات میں موجود ہے، یہ مضمون خود کندن لال کی ایک کتاب منتخب تنقیح الاخبار سے ماخوذ ہے، جس سے زیادہ مستند دوسرا ماخذ نہیں ہو سکتا، اس میں انھوں نے اپنے اساتذہ کے نام بھی لکھے ہیں، اُن میں شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحب کے اسمائے گرامی بھی ہیں، مولانا شروانی لکھتے ہیں:-

لالہ کندن لال نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ایک بخاری سید (اشکی کے پہلے استاد میر جعفر بخاری سنبھلی) کے آغوش تربیت میں پایا،........ مولوی رفیع الدین صاحب دہلوی اس خاندان کے رکن رکین تھے، جو کئی پشت تک ہندوستان کا مذہبی و دینی پیشوا رہا، اس کی شفقت

اُن پر مذہب کا غلبہ ہوتا گیا، اور علمی و دینی مصروفیات بڑھتی گئیں، اور مختلف امراض لاحق ہوتے گئے، اس فن سے دور ہوتے گئے، اس لئے یقینی ہے کہ یہ تصنیف بھی عنفوان شباب کی یادگار ہوگی، مگر اس وقت بھی موسیقی کا رنگ آپ پر پوری طرح غالب نہ رہا ہوگا، بلکہ دینی مشاغل کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی تفنن طبع کی خاطر موسیقی بھی سُن لیا کرتے تھے اور اس فن کے شائقین کو اس کے رموز بھی تبلا دیا کرتے رہے ہوں گے، لیکن قیاس ہے کہ عمر میں اضافہ کے ساتھ ساتھ دینی علوم سے جسقدر اُن کا شغف بڑھتا گیا، دوسرے فنون خصوصاً موسیقی سے رغبت اور دلچسپی گھٹتی گئی، اور آخر عمر میں اُن کا خاص مشغلہ صرف دینی علوم خصوصاً تفسیر وحدیث کا درس رہ گیا تھا، اُن کے تلامذہ زیادہ تر اسی دور کے ہیں، جب موسیقی کو وہ ترک کر چکے تھے، اس لئے اس دور کے تلامذہ نے اس کا تذکرہ نہیں کیا، ممکن ہے، اس کا ذکر ان کی ثقاہت کے خلاف بھی

(بقیہ حاشیہ ص ۴۶۴)

دیکھو کہ کندن لال اور ان کے باپ (منو لال فلسفی) دونوں کو دامن شفقت میں رکھا، استادوں کی محبت و عظمت میں راجہ کندن لال کے یہ الفاظ ہیں، "قدوۃ العلماء الراسخین فی العلم امام المتاہلین مولوی محمد رفیع الدین صاحب کہ استاد والد من نیز بود" انیس سال کی عمر میں دلی جانے کا اتفاق ہوا، وہاں پہنچکر اپنے والد کے استاد مولوی رفیع الدین صاحب کی خدمت میں زانوے تلمذ تہ کیا، اور رسالہ مساکن ایام و لیالی شاذ و سیوس مجسطی اور طبعیات شفا کا درس لیا،........ راجہ کندن لال اشکی کی ہمہ گیر طبیعت کا رنگ ان کی تصانیف اُن کی مختلف ملازمتوں اور ان اہل کمال کی فہرست سے ٹپک رہا ہے، جن سے وہ ملے یہ ہمہ گیر طبیعتیں وہی تعلیم پیدا کر سکیں، جس پر صرف قدامت کے جرم میں نفرت کی نگاہیں پڑتی ہیں" (مقالات شروانی)

سمجھتے رہے ہوں اس کے علاوہ اُن کو جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے بعض سوداوی امراض ایسے تھے، جن میں موسیقی سننے سے ہیجان پیدا ہوتا، اور امراض میں اضافہ ہوتا تھا، اس لئے صحت کے خیال سے بھی انھوں نے اُس کو چھوڑ دیا تھا،

اتفاق سے جو روایتیں ہم تک پہونچی ہیں، اُن میں صرف وہی علماء ہیں، جنھوں نے شاہ صاحب کا یہ رنگ دیکھا تھا، اور اُن کی ذات بابرکت سے اسی حیثیت سے منسلک تھے، انھیں شاہ صاحب کی موسیقی دانی کا پوری طرح سے علم نہ تھا، اور اگر علم رہا بھی ہوگا تو اسے زیادہ اہمیت نہ دی ہوگی،

شاہ صاحب خود بھی اخیر عمر میں جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے موسیقی کی طرف بہت کم توجہ کرتے تھے، لیکن جب اس کا تذکرہ آتا تھا، تو اپنی دلچسپی کا بھی ذکر کر دیتے تھے جیسا کہ اُن کے ملفوظات کے حوالہ سے اوپر گذر چکا ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۴۶۵)

ان تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ کندن لال شاہ رفیع الدین صاحب کے شاگرد تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا نام تو اس فہرست میں نہیں ہے، لیکن قیاس ہے کہ انھوں نے شاہ رفیع الدین صاحب کے بڑے بھائی شاہ عبدالعزیزؒ سے بھی جن کا حلقہ شاہ رفیع الدین صاحب سے بھی زیادہ وسیع تھا، ضرور استفادہ کیا ہوگا، یا کم سے کم اُن کو اپنے استاد ہی کے درجہ میں رکھتے تھے جیسا کہ انھوں نے موسیقی کے رسالہ کے دیباچہ میں اُستاذی لکھا ہے، اس لئے شاہ عبدالعزیز صاحب سے اُن کا تعلق اور اُن کی عقیدت بہرحال مسلّم ہے،

"م"

بہرحال یہ رسالہ شاہ صاحب کی تصانیف میں ایک اہم اضافہ ہے، اور اسی سے اُن کی موسیقی دانی کا اندازہ ہوتا ہے، کہ وہ اس فن میں بھی دوسرے علوم و فنون کی طرح استاد کامل تھے، اس فن کا ذوق بھی دوسرے فنون کی طرح انھوں نے اپنے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ سے وراثت میں پایا تھا، ہر طالب علم کو شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کو بھی اس فن سے دلچسپی تھی، اور اس کی اچھی واقفیت رکھتے تھے،[۵۱]

---

[۵۱] الفوز الکبیر ص ۶۶،

آثار علمیہ و ادبیہ

مکاتیب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

بنام

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت الاستاذؒ کے نام مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے خطوط معارف میں شائع ہو چکے ہیں، کچھ خطوط اب ملے ہیں اس لیے ان کو شائع کیا جاتا ہے۔ م

۱۱ر صفر ۱۳۵۷ھ

مکرمی ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۱۰ر اپریل کے سامی نامے کا شکریہ، جاوی طلباء کے آنے سے مسرت ہوئی، میں نے فی وظیفہ عـ۱ ماہوار خیال کر کے جو وظیفوں کا وعدہ کیا تھا، اب ایک پندرہ (عـ۱۵) ماہوار کا مطلوب ہے، انشاء اللہ ماہ مئی سے جاری ہو جائے گا، ناظم صاحب کو اطلاع دیتا ہوں، مطلب یہ ہے کہ اپریل کا وظیفہ مئی میں پہنچ جائے گا۔ آپ علی گڑھ آتے رہے، مگر ملاقات نہ ہوئی، اس کا افسوس ہے، کیا مولوی مسعود علی صاحب لکھنؤ سے واپس آئے۔ فائز المرام ! میرا اسلام، آپ نے مکاتیب سنائی کا شوق ظاہر کیا تھا، یہاں کوئی کاتب ذی استعداد نہیں جو عبارت مکاتیب صحیح لکھ سکے، وہاں انتظام ہو سکے تو نسخہ بھیج دوں۔

الحمد للہ خیریت ہے، آپ کی خیریت کی تمنا۔

حبیب الرحمٰن

۱۹ر مئی ۱۹۴۱ء

مکرمی ! السلام علیکم

مئی کا معارف آیا، پڑھا، محبی محمد ریاض الحسن خاں کی تحریر عرصے بعد پڑھکر خاص مسرت ہوئی، بیان کی روانی، صفائی، ایجاز، تحقیق سب سرور افزا ہیں۔

مولوی مسعود عالم کا مضمون پڑھکر ذہن نے مناظرے کی گرمی محسوس کی، واقعات صاف محققانہ بیان ہوں، گرمی، ہنگامہ مقصد کو فوت کر دیتی ہے، ندوۃ العلماء نے اسی گرمی کو سرد کر کے فضیلت علمی صاف کی جس کا جلوہ دار المصنفین میں ہے، جس کا ایک جزء معارف ہے، زندہ باد معارف و معارف پرور۔

وہی فضا قائم رہنی چاہیے، ممکن ہے کہ میرا خیال صحیح نہ ہو، تاہم اس احساس کو آپ کے سامنے لے آنا مناسب سمجھا۔ والسلام

حبیب الرحمٰن

۲ر اگست ۱۹۴۱ء

مکرمی ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

۲۱ر جولائی کا سامی نامہ سامنے ہے، ۲۴ر ماہ رفتہ کو نزول دار المصنفین میں مع الخیر ہوا ہوگا، اور اب آپ خود اور اعزہ سلمہم مع الخیر ہوں گے، للہ الحمد یہاں خیریت ہے، امساک باراں عامۂ خلق کے لیے صبر آزما ہے۔

ڈاکٹر اسلام الحق صاحب کا تقرر یونیورسٹی میں ہو گیا، آپ کا انتخاب کامیاب ثابت ہوا۔

مولوی شفیع صاحب کی جگہ بھی انتخاب مولوی وسیم الحق کا ہوگیا، جو فرنگی محلی کے شاگرد ہیں،
چینی طلباء کی آمد بہت مبارک ہے اور ان کی خدمت بڑی خدمت "ولو بالصین" حد سفر
دار العلوم کی طرف سفر فرما ہے۔

میری جانب سے جو ۱۰ر روپیہ ماہوار کے وظائف ہیں ان میں سے ایک حصہ ان طلبا
کے لیے مخصوص کیا جاسکتا ہے، مثلاً ۵ر ماہوار کے، پانچ طالب علم ضرور قبول فرمائیں،
ضرورت ہوگی تو میں ڈاکٹر عبد العلی صاحب کو لکھ دوں گا۔

مولوی مسعود علی صاحب کو سلام شوق، شغل انبہ جاری ہوگا، جیسا الحمد للہ یہاں بھی
جاری ہے،

والسلام

نیاز مند حبیب الرحمٰن

حیدر آباد کی صدارت میں انقلاب ہوا ہے، اللہ تعالیٰ پہلوئے خیر پر منقلب فرمائے۔

جبلپور
۱۸ اپریل ۴۲ء

مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

علی گڑھ کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی تقریب سے یہاں حاضر ہوں، "حیات شبلی" ساتھ لایا تھا،
ریل میں دیکھی، یہاں فرصت کے اوقات میں دیکھی، اسی شوق سے جس شوق سے مسودہ پڑھا تھا،
نگاہ مکرر نے خوبی تصنیف کو اور زیادہ نمایاں وتاباں کیا ع زیدک وجہہ حسنا اذا ما زدتہ نظرا۔ ابھی پڑھکر
ختم کرکے رکھی ہے۔ ع اک نیا انداز پیدا ہوگا جتنا دیکھئے۔ (داغ)
ہر موقع پر جہاں آپ کے قلم سے "شروانی" کا حوالہ نکلا ہے، اس کو پڑھ کر، دیکھکر ایک کیف سرور پیدا
ہوتا ہے، گویا بادۂ محبت کا دور سرور افزا ہے، مکرر نظر پر بھی یہ سمجھنے میں نہ آیا کہ جواب
لکھنے والے کیا لکھیں گے۔ والسلام

عزیزی مسعود علی کو سلام شوق۔

حبیب الرحمٰن

۲۰ مارچ ۱۹۴۲ء م ۱۵ ربیع الآخر ۱۳۶۱ھ

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

شہر حال کے معارف میں نواب فصاحت جنگ مرحوم پر "وفیات" میں آپ کا مقالہ پڑھا،
یاد تازہ ہوئی، تازگی نے کیا کیا گل کھلائے، ایک واقعہ سنادوں، حیدر آباد سے قطع تعلق کے بعد
جب میں روانہ ہوا تو حدود ریاست کے اندر ریل میں ایک مضمون بے فکر دماغ میں جلوہ گستر ہوا ع

شاہباز ہمتم ربط بدست شاہ داشت خوش نکردہ بند وبست دیگراں پرواز کرد

اس میں علیحدگی کی علت مستتر تھی۔ ابتدا سے صدر الصدور کا تعلق بلاواسطہ ذات شاہانہ سے تھا، آخر
میں حریفوں نے سازش کی یہ تعلق نہ رہا، باب حکومت کی ماتحتی ہوئی، یہی باعث ہوا استعفا کا،
مکان پر آکر جو خط میں نے جلیل مرحوم کو لکھا اس میں یہ شعر بھی درج کیا، جواب میں یہ شعر آیا،

شاہباز اوج ہمت حضرت قدسی نہاد صید کردہ مرغ جانم از دکن پرواز کرد

ایک دوسرا موقع۔ حاضری حیدر آباد کے زمانے میں معمول تھا کہ اواخر شہر میں ایک شب
حافظ صاحب کے کاشانہ میں شرکت تراویح کرتا۔ عزیزی قاری حسن سلمہ کا کلام سعید سنتا۔
وہاں سے چلے آنے پر غیر حاضری محسوس ہوئی، یہ شعر آیا

جلوۂ حسرت اگر ملک دکن خالی کرد جائے غم نیست کہ دل نیست ز حسرت خالی

یہ شعر بتاتے ہیں کہ جلیل مرحوم کو فارسی کلام پر بھی قدرت تھی، دوسرے شعر میں آخر مصرعہ میں حسرت
کا لفظ کیسا معنی خیز ہے، اگر دل چاہے تو معارف میں اس کو لے آیئے، زیر خط الفاظ چھوڑ دیئے جائیں،

والسلام

حبیب الرحمٰن

آپ کے سفر حج کے ارادہ سے دلی مسرت ہوئی، اللہ تعالیٰ مبارک فرمائے۔

امید ہے کہ مزاج گرامی مع الخیر و بعافیت ہوگا، الحمدللہ تعالیٰ میں بعافیت ہوں،

والسلام

حبیب الرحمٰن

حبیب گنج ضلع علی گڑھ

ا رشعبان ۱۳۶۶ھ

مکرم گرامی قدر ذوالفضائل

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ - ۶ رشہر حال کا مسرت نامہ آیا، ایک انبار مسرت ساتھ لایا، کھول کر پڑھا پھر پڑھا، پھر پڑھا، معلوم نہیں کتنی دفعہ دیکھا، ہر مرتبہ مسرت تازہ محسوس کی، اس وقت بھی جواب لکھنے سے اول پڑھا،

الحمدللہ تعالیٰ بہمہ وجوہ بعافیت ہوں، بلحاظ صحت وعافیت بلحاظ معاملات ریاست، عجیب امر یہ ہے کہ اہل غرض قسم قسم کی خبریں اڑاتے رہتے ہیں، کبھی صحت کے متعلق استفسار ہوتا ہے کہ آپ کی سخت علالت کی خبریں آرہی ہیں، کبھی ریاست وجائداد کے متعلق، جو بفضلہ تعالیٰ سراپا برکت ہوتی ہیں، اطمینان رکھیے۔

"خیر التواریخ" پسند ہوئی، اس سے مسرت رہی، اچھا کام کیا ہے۔

حج بیت اللہ کا قصد آپ کا پڑھکر قلبی مسرت ہوئی، مبارک ہو، بعافیت وسلامت پورا ہو نیازمندوں کے ساتھ شروانی نیازمند بھی گوشۂ خاطر میں بعونہ تعالیٰ رہے گا، اس کا یقین ہے،

والسلام ختم الکلام

حبیب الرحمٰن

حبیب گنج ضلع علی گڑھ

۸ رجب ۱۳۶۵ھ

مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کی، مولوی مسعود علی کی خیروعافیت مولوی عبدالباری سے ان کی خیریت کے ساتھ طلب کی تھی، انتظار جواب رہا، شاید خط نہیں پہنچا، غیب سے آپ کو خط بھیجنے کا پاک سامان ہوا، مدینہ طیبہ سے تحریر آپ کے نام کی ارسال کرنے کے لیے موصول ہوئی، ملفوف ہے۔

اپنی اور مولوی مسعود علی کی خیروعافیت سے ممنون کیجیے، میں بحمداللہ تعالیٰ بعافیت ہوں۔

والسلام

حبیب الرحمٰن

حبیب گنج

۱۲ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ / ۱۹۴۶ء

مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حسب معمول یہ تحریر[1] میرے خط میں آئی ہے، روانہ کرتا ہوں، ایک لفافہ میرے نام کا اعظم گڑھ پہنچا، واپس گیا، دوسرے خط کے ساتھ میرے پاس آیا، آپ کی دلچسپی کے لیے ملفوف کرتا ہوں،

الحمدللہ خیروعافیت سے ہوں، ماہ مبارک بعافیت وبرکت گزر رہا ہے،

آپ اور مولوی مسعود علی ہمیشہ یاد آتے ہیں، خیریت سننے کو دل چاہتا ہے، امید ہے کہ ماہ مبارک برکات وسعادت کے ساتھ گزر رہا ہوگا۔

والسلام

حبیب الرحمٰن

حبیب منزل علی گڑھ

۲۵ جون ۱۹۴۷ء

مکرمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تشکر کرامت۔ مولانا مناظر احسن صاحب انشاء اللہ علی گڑھ آئیں گے، مسلم یونیورسٹی فیضیاب بفضلہ تعالیٰ ہوگی۔

---

[1] مدینہ منورہ کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ طیبہ کے ناظم ابراہیم حمدی کے خط کی طرف اشارہ ہے۔

مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

سیرۃ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے مکرر طبع پر اظہار مسرت کر چکا ہوں، دل میں آیا کہ سفر حجاز میں حاضری جنۃ البقیع کے موقعہ پر حضرت صدیقہؓ کے مزار پُر انوار پر جو کیف قلب نے محسوس کیا تھا وہ اپنے سفرنامے کے لکھے نسخے سے نقل کر کے آپ کو بھیجوں۔ وہو ہذا۔

"اس کے (حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے مزار مبارک پر حاضری کے) بعد حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے مرقد مبارک پر حاضر ہوا، حاضر ہونے کے بعد امومیت کی نسبت اس قوت سے قلب پر طاری ہوئی کہ بیان میں نہیں آسکتی، جوش رقت میں امی امی کی صدا دل و زبان کے ساتھ گویا جسم کا ریشہ ریشہ دے رہا تھا، اور روح محو ذوق تھی، بے شائبہ تکلف محسوس ہوتا تھا کہ بچے نے مدت دراز کی مفارقت کے بعد شفیق ماں کو دفعۃً پالیا ہے، اور جوش محبت واحساس شفقت سے بے تاب ہو ہو کر امی امی پکار رہا ہے، الفاظ کچھ ایسا ہی نقشہ کھینچ سکتے ہیں، غرض ایک عالم تھا، جو اس آشیانہ مرحمت کاشانہ کے ساتھ مخصوص تھا، رضی اللہ تعالیٰ عنہا وارضاہا عنی۔"

مولانا سید سلیمان اشرف صاحب مرحوم نے یہ بیان پڑھ کر حسب ذیل الفاظ لکھے تھے:۔

"حضرت مولانا گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک خاص نسبت حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے تھی، یہ اسی نسبت کا پرتو تھا، جو مزار اقدس پر حاضری کے وقت آپ پر وارد ہوا۔"

نیاز مند

حبیب الرحمٰن

ادبیات

نالۂ دل

بر مزار حضرت مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ

از جناب پروفیسر نیر واسطی لاہور

بیامد بر در جامیؒ گدائے — فقیرے، خستہ حالے بینوائے

بیامد تشنۂ بر سلسبیلے — غریبے، سائلے ابن السبیلے

ز خاکِ پاک بہر دلستانے — دلے بیتاب و چشمے خونفشانے

نوایش نالۂ درد آشنائے — شکست شیشۂ دل راصدائے

دل از دیوانگی آوارۂ عشق — جگر از سوز آتش پارۂ عشق

گدائے رہ نشین جادۂ جام — ز سرمستی خرابِ بادۂ جام

بر رخ زرد و بہ سر خاکِ غریبی — بہ لب قُم یا حبیبی یا حبیبی

بصحرائے جنوں رختِ سفر بست — ز سر ہوش و ز لب آہ و دل از دست

برآمد از درونِ دل خروشم — کہ من دل را بجامِ تو فروشم

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

نفس نفس میں زندگی جاوداں لیے ہوئے — پیام دوست آگیا قرار جاں لیے ہوئے

شعورِ سجدہ چاہیے، تلاشِ سنگِ در ہے کیا
جبینِ شوق آپ ہر اک آستاں لیے ہوئے

چمن سے اسکا باغباں مٹا سکے گا کیا نشاں
جو بجلیوں کے سائے میں ہے آشیاں لیے ہوئے

وہ دور اُف کہاں گیا، وہ وقت کیا نہ آئیگا
کہ جب حیات تھی سکونِ جاوداں لیے ہوئے

دمِ سحر چمن میں کون آج مسکرا دیا
روش روش ہے اک بہارِ گلفشاں لیے ہوئے

نے اگر کوئی تو ہے فضائے دہر آج بھی
دکھے ہوئے دلوں کی کچھ کہانیاں لیے ہوئے

فسانۂ غم و الم نہ چھیڑ جو ہر حزیں
کہ زندگی ہے زندگی کی تلخیاں لیے ہوئے

غزل

از جناب مولوی زین الدین صاحب اصلاحی نیرؔ

یہ ساغرِ بادۂ عرفاں ہے کچھ جامِ گلفام نہیں
حافظ ہیں، یہاں عطار یہاں اس محفل میں خیام نہیں

ہے لطفِ کرم یاں عام سدا ہاں نرگسِ مست ساقی ہے
لب زیر بھی ہیں جام و سبو اک رند بھی تشنہ کام نہیں

ان مست نگاہوں کے صدقے ہم پیتے ہی رہتے ہیں ہمدم
جب ساقی کو انکار نہیں تو ہم کو بھی ابرام نہیں

اے گردشِ دوراں سن تو سہی کیوں حسن کی محفل سونی ہے
صیاد میں کیوں خاموش کھڑے اک صید بھی زیرِ دام نہیں

اے ناصحِ مشفق سن تو سہی کیوں پیرِ مغاں سے برہم ہے
کیوں رندوں سے یہ بغض و حسد کیوں ساغر کا اکرام نہیں

یہ فصلِ بہاری لالہ و گل یہ مطرب رنگیں ساغر و مل
جب تم ہی نہیں ہو میرے قریں کچھ ان سے مجھکو کام نہیں

ہم صاف بھی پیتے ہیں نیرؔ اور تلچھٹ بھی پی لیتے ہیں
وہ لذتِ بادہ کیا جانے جو رند کہ دُرد آشام نہیں

مطبوعات جدیدہ

ہمعات - از شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ، صفحات ۱۳۶، کتابت و طباعت بہتر، ناشر شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر، حیدرآباد (پاکستان) قیمت ۶

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ جس طرح تفسیر و حدیث اور فقہ و کلام کے امام تھے، اسی طرح تصوف و احسان کے بھی امام تھے، اور انھوں نے اس میں بڑی تجدیدات کی ہیں، اس موضوع پر ان کی متعدد کتابیں ہیں جن میں القول الجمیل، سطعات اور لمحات پر معارف کے صفحات میں تبصرہ آچکا ہے، ان کتابوں کو انھوں نے ایک خاص مقصد اور ترتیب سے لکھا ہے، سلوک کے مبتدیوں کے لیے القول الجمیل لکھی، پھر منتہیوں کے لیے سطعات مرتب کی، اسی طرح "لمحات" اور "الطاف القدس" وغیرہ میں عقل، ارادہ اور نفس سے متعلق مزید تفصیلات کی ہیں، ہمعات کو تصوف کی فنی تاریخ سمجھنا چاہیے، انھوں نے اس میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے، کہ تصوف و احسان کوئی نو پیدا چیز نہیں ہے، بلکہ یہ روح دین ہے، جس کے حصول اور وصول کے ذرائع میں قدرے اختلاف ہے، مگر مقصد میں کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ اس نے فنی اور فلسفیانہ حیثیت کئی صدی بعد اختیار کی۔ ائمۂ تصوف کی صحبت میں کیسے کیسے کاملین امت پیدا ہوئے، اور انھوں نے کیا کام کیے۔

اول الذکر کتابوں کی زبان عربی ہے، مگر ہمعات کو شاہ صاحب نے غالباً افادۂ عام کے خیال سے فارسی میں مرتب کیا ہے، شاہ ولی اللہ اکیڈمی جس نے شاہ صاحب کی متعدد کتابیں شائع کی ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کی سعادت بھی اسی کے حصہ میں آئی ہے،

آیات بینات ۔ از نواب محسن الملک مرحوم، صفحات ہر دو جلد ۸۸۸ کتابت وطباعت متوسط، ناشر دار الاشاعت مولوی مسافر خانہ کراچی، قیمت لعہ
اول و دوم

نواب محسن الملک مرحوم نے سیاسی و ملی کاموں کے ساتھ کچھ ایسے علمی و دینی کام بھی کیے ہیں جن کی وجہ سے ان کی یاد ہمیشہ باقی رہے گی، ان ہی علمی یادگاروں میں آیات بینات بھی ہے، جو شیعی عقائد کی تردید اور ان اعتراضات کے جواب میں ہے جو شیعہ اہل سنت پر کرتے ہیں، نواب محسن الملک مرحوم نے ایک شیعہ گھرانے میں آنکھ کھولی اور اپنے مذہب کے ممتاز عالم تھے، لیکن پھر ذاتی مطالعہ کے بعد انھوں نے شیعیت چھوڑ کر تسنن اختیار کر لیا، اور شیعی عقائد کی تردید اور ان کے اعتراضات کے جواب میں یہ محققانہ کتاب لکھی کتاب کا انداز بیان نہایت ہی متین اور سنجیدہ ہے، اور جوابات بھی لکھی ہے وہ تاریخی و علمی شواہد کی بنیاد پر اور خود شیعہ حضرات کی متداول اور مسلم کتابوں کے حوالے سے لکھی ہے، کہیں بھی انھوں نے مناظرانہ انداز اختیار نہیں کیا ہے، اور نہ الزامی جواب دینے کی کوشش کی ہے، جس طرح عربی زبان میں امام ابن تیمیہ کی منہاج السنہ اور فارسی میں شاہ عبد العزیز صاحب کی تحفہ اثنا عشریہ کا جواب نہیں دیا جا سکا اسی طرح اردو میں آیات بینات کا جواب بھی ابتک نہیں دیا جا سکا، یہ کتاب آج سے ۰۰ برس پہلے مطبع مصطفائی سے شائع ہوئی تھی، اس کے بعد نایاب ہو گئی تھی، اب دوبارہ یا سہ بارہ دار الاشاعت کراچی نے اسے شائع کیا ہے، یہ کتاب ہر مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے، اس کے مطالعہ سے بہت سے فتنوں سے ہماری نسل بچ جائے گی۔

قیام عالم اور حیات آدم ۔ از مولوی سراج الحق صاحب مچھلی شہری، صفحات ۸۸، کتابت وطباعت متوسط، ناشر خورشید تاج کمپنی، الہ آباد، قیمت عمر

مولوی سراج الحق صاحب متعدد علمی و دینی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ایک قیام عالم اور حیات آدم

بھی ہے، اس میں انھوں نے کائنات کی تخلیق اور حضرت آدم کی آفرینش کے تمام مراحل، اور پھر ان کے ہبوط ارضی کے تمام واقعات کو تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے، جا بجا انھوں نے مفسرین سے اختلاف بھی کیا ہے، اس کتاب کے بعض مباحث ایسے بھی ہیں جن کو موجودہ مذاق قبول نہیں کرتا، زبان و بیان کی بھی خامیاں ہیں لیکن مصنف نے اس میں سیکڑوں آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے بارے میں بڑی پر معلومات باتیں جمع کر دی ہیں، اس لیے عام مسلمانوں کے مطالعہ کے لائق ہے۔

مونس المریدین ۔ از شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری، صفحات ۱۸۲، کتابت وطباعت بہتر، ناشر بیت الشرف خانقاہ بہار شریف، قیمت ےر

شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری نے جو ایمان افروز لٹریچر چھوڑا ہے، ان میں تصنیفات اور مکتوبات کے علاوہ ان کے وہ ملفوظات بھی ہیں جنھیں ان کے مستفیدین اپنے اپنے ذوق کے مطابق جمع کر لیا تھا، یہ تمام ملفوظات فارسی میں تھے، جنھیں مولانا قسیم الدین نے اردو کا ستھرا جامہ پہنایا ہے، اس سے پہلے ان کے ایک مجموعۂ ملفوظات فوائد المریدین کا ذکر معارف میں آ چکا ہے، اب یہ دوسرا مفید مجموعہ مونس المریدین سامنے آیا ہے، عموماً ترجمہ میں اصل کی تاثیر باقی نہیں رہ جاتی، مگر شیخ کے ملفوظات اتنے پر اثر ہیں کہ ترجمہ کا حجاب بھی اس کی تاثیر میں مانع نہیں بن سکا ہے، ان ملفوظات کے ایک ایک فقرہ سے خدا ترسی اور للہیت ظاہر ہوتی ہے، اور قلب میں سرور کی ایک عجیب کیفیت محسوس ہوتی ہے، ملفوظات زیادہ تر مستفیدین کے سوالات کے جوابات میں ہیں، ان میں عورتوں کے معمولی سوالات سے لیکر عالمانہ اور عارفانہ ہر طرح کے سوالات کے نہایت شافی جواب موجود ہیں، یہ ملفوظات مرتب نے تاریخ وار جمع کیے ہیں، جس سے شیخ کی زندگی کے بہت سے گوشوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

مناقب شعیب ۔ از عبد الواسع فردوسی، صفحات ۲۰۲، کتابت وطباعت بہتر، پتہ ہندوستان میں: خانقاہ شیخپورہ، مونگیر۔ پاکستان میں: محمد حسان صدیقی ۹۶ ڈوری اینگل لین، ڈاکخانہ بل خانہ، ڈھاکہ
قیمت عا ر ۵، نئے پیسے

ساتویں صدی میں جو ممتاز صوفیائے کرام پیدا ہوئے، اور جنھوں نے ہندوستان کے گوشے گوشے کو ایمان کی روشنی سے منور کیا، ان میں شیخ شاہ شعیب جلال منیری رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں، یہ حضرت شیخ یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین اور آپ کے چچازاد بھائی تھے، سلسلۂ فردوسیہ کے عام بزرگوں کی طرح انھوں نے بھی گمنامی کی زندگی گذارنے کی کوشش کی، اس لیے ان کے کرامات کے کچھ قصے تو ضرور محفوظ ہیں مگر انکی زندگی کے حالات بہت کم ملتے ہیں، مولانا عبدالواسع صاحب صدیقی جن کو خاندانی نسبت کے ساتھ بزرگوں سے روحانی تعلق بھی ہے، بڑی محنت سے شیخ کے حالات، ان کے معمولات اور ان کی تعلیمات کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے، اہل اللہ کی کرامات کے ذکر سے ایمان باللہ اور ایمان بالغیب میں زیادتی یقیناً ہوتی ہے، مگر انزلوا الناس علیٰ قدر عقولھم کے تحت ان کے ذکر میں موقع و محل اور انتخاب کی ضرورت بہرحال ضروری ہے، یوں کتاب اپنے موضوع پر بہت ہی جامع اور مطالعہ کے لائق ہے۔

بادۂ و جام - از شارق میرٹھی، صفحات ۹۶، کتابت و طباعت متوسط۔ پتہ (۱) دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ (۲) مرکز ادب، رحمانیہ کالج۔ رگول ہمیر پور۔ قیمت عہ

شارق میرٹھی ملک کے معروف شعراء میں ہیں، انھوں نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی، پھر عام رجحان کے تحت نظم کی طرف مائل ہوئے، مگر کچھ دنوں کے بعد وہ پھر غزل کی طرف لوٹے اور اب زیادہ تر اسی صنف میں طبع آزمائی کرتے ہیں، بادۂ و جام انکی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے، انکی غزلیں زبان و بیان اور پاکیزگی خیال کا اچھا نمونہ ہیں، عشق و محبت کی واردات اور درد و سوز کی کیفیات سے بھی ان کا کلام خالی نہیں ہے، بلکہ کہیں کہیں تو ان کے کلام میں خواجہ میر درد کا رنگ ملتا ہے، ایک دو غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ہر چیز میں دل کشی ملے گی — ذروں میں بھی روشنی ملے گی
ہر گام پہ راہبر ملیں گے — ہر گام پہ رہزنی ملے گی
کہتا تھا یہ کوئی دل جلا کل — مٹ جا کہ خود آگہی ملے گی

تیسرے شعر میں دل جلا کا لفظ یہاں قابل اصلاح ہے۔

بجلیوں میں گھر کے اے شارق ہمیں — آشیانے کا بنانا آگیا
آج تو قید غم چھوٹ گیا — آپ سے آپ قفس ٹوٹ گیا